ڈاکٹر ذاکر حسین

ماہانا — جون ۱۹۴۷ء — [illegible] کا [illegible] جامعہ ملیہ اسلامیہ

...ted by Mr. Masoodul Haque on behalf of Teacher ...
... Janty Printing Works, Jama Ma...

ڈاکٹر ذاکر حسین کی یاد میں

سالنامہ ۷۳-۱۹۷۲ء استادوں کا مدرسہ جامعہ ملیہ اسلامیہ



مجلس ادارت

مُدیر اُردو: عبدالغفار آزاد متعلم بی ایڈ، مُدیر انگریزی: مدھو شرما متعلم بی ایڈ
مُدیر ہندی: پشپا شرما متعلم بی ایڈ
اسٹاف ایڈوائزر: مسعود الحق (لیکچرر ٹیچرس کالج)

فہرست

اداریہ

عبدالغفار ارشد

ڈاکٹر ذاکر حسین کا نام آتے ہی ذہن میں جامعہ ملیہ کی تصویر آجاتی ہے اور جب کوئی جامعہ کا ذکر کرتا ہے تو ڈاکٹر ذاکر حسین کی پوری شخصیت اپنے تمام جلال و جمال کے ساتھ نظروں میں گھوم جاتی ہے ذاکر صاحب جمہوریہ ہند کے نائب صدر بھی رہے اور صدر بھی مگر ہمارا اور ان کا تعلق جامعہ کے بنانے والے اور ملک کے عظیم ماہر تعلیم کی حیثیت سے اصلی بھی ہے اور گہرا بھی۔ اس تعلق کی بنا پر ان کے پچھترویں یوم پیدائش کے موقع پر ہم نے اپنے رسالے کو انہیں یاد کرنے کا ایک وسیلہ بنایا ہے

ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ یہ ذاکر صاحب کے شایان شان نہیں ہے اسے بہت اچھا ہونا چاہئے مگر کیا کیجئے مالی وسائل کی کمی نے ہمارے حوصلوں کو آخرکار پست کر ہی دیا ان تمام کمیوں کے باوجود ہمیں امید ہے کہ آپ کو رسالے کے کچھ مضامین ضرور پسند آئیں گے

ہم ان تمام طالب علموں اور استادوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں، جنہوں نے عملی طور پر ہماری امداد فرمائی اور ان لوگوں سے معذرت خواہ ہیں جن کی تخلیقات کو ہم جگہ کی کمی کی وجہ سے شامل نہ کر سکے

مُدیر

ڈاکٹر ذاکر حسین ــــ ایک خاکہ

پروفیسر محمد مجیب

ہوشیار لوگ برسوں سے اس کوشش میں لگے ہیں کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت کا اندازہ کریں کوشش کرنے پر وہ مجبور تھے اس وجہ سے کہ ذاکر صاحب ممتاز حیثیت کے مالک تھے اور وہ اپنی کوشش کے نتیجے سے مطمئن بھی ہو گئے اگرچہ ان کی کامیابی اتنی ہی محدود تھی جتنی کہ ان کی اپنی غرض اور نظر اسی وجہ سے ڈاکٹر ذاکر حسین کی وہ صفتیں جو وقت کے ساتھ نمایاں ہوئی تھیں ان لوگوں کو حیرت میں ڈالتی رہی تھیں جو کسی لمبی مدت تک ان کی کارگزاری کو دیکھتے رہے۔ طالب علمی کے زمانے میں ڈاکٹر صاحب بہت ہر دل عزیز تھے۔ لیکن ان کی تعریف کرنے والوں میں کسی کو گمان نہیں تھا کہ ان میں علم حاصل کرنے کا کوئی حوصلہ ہے ان کی شخصیت میں بڑی کشش تھی ان کی گفتگو پُرلطف تھی۔ وہ بحث میں تیز تھے۔ وہ بہت عجیب عجیب اور دلکش حرکتیں کرتے تھے۔ مثلاً ایک مرتبہ وہ کسی معمول کا ایک پورا مرتبان کھا گئے اور بڑے بھولے پن سے اس کی یہ وجہ بتلائی میں کیا کرتا بھوک لگی تھی اور کھانے کو کوئی اور چیز نہ تھی۔ ان کی تعریف کرنے والوں میں سے کسی کو اس کا بھی خیال نہ ہوا کہ ان کا لاابالی پن ظاہری ہے اور ان کی طبیعت کی گہرائی میں اور بہت کچھ ہے جس کا پتہ نہیں چلتا جب انہوں نے حالات سے اثر لے کر مسلم یونیورسٹی کو چھوڑا اور جامعہ ملیہ کو قائم کرنے میں شریک ہوئے تو ان کے پرانے دوستوں کو تعجب ہوا اور بعض کو افسوس بھی لیکن پھر انہوں نے بھی دیکھا کہ انہوں نے اپنے لاابالی پن کو چھوڑا نہیں ہے اور پہلے کی طرح مزے مزے کی باتیں کرتے ہیں۔

گویا اسی زمانے سے ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہو گیا تھا اور وقت کے ساتھ اور مشکل ہوتا گیا۔ دراصل ان کی شخصیت میں کوئی کایا پلٹ نہیں ہوئی تھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ پہلے ایک زندہ دل نوجوان تھے اور بدل کر جوشیلے نیشنلسٹ ہو گئے اور ایسے معلم ہو گئے کہ جسے تعلیم کے سوا دنیا کے کسی معاملے سے مطلب نہ ہو۔ یا معلم تھے اور بدل کر ایک ناخدا بن گئے جو اپنے چھوٹے سے ادارے جامعہ ملیہ کو سیاسی طوفان

میں سے بچا کر نکال لایا۔ گورنر ہونے کے بعد یا وائس پریسیڈنٹ منتخب ہونے کے بعد وہ اور سب کچھ بھول کر حکومت کے ایک ممتاز رکن نہیں بن گئے ان کی زندگی ایک سیدھا سادہ معاملہ ہے قدرتی صلاحیتوں کی بنا پر بیج کے پودے اور پودے کے درخت سے ان صلاحیتوں کے رفتہ رفتہ ظاہر ہونے کا جو موجود تھیں اور بروئے کار نہیں آئی تھیں۔ ۱۹۲۰ء کے ہنگامے میں وہ صوفیوں کے اصول کے مطابق دل دہاں سے تالیف قلوب میں مشغول ہو گئے اور انہوں نے جامعہ ملیہ کو اس اصول کی ایک زندہ مثال بنا دیا۔ شیخ الجامعہ کی حیثیت سے ان کو اسی روپے ماہانہ ملتے تھے اور جامعہ ملیہ کی مالی حالت بہت خراب تھی، جب انہیں مسلم یونیورسٹی کا وائس چانسلر بننے پر مجبور کیا گیا لیکن یہ بھی ایک طرح زندگی کے سفر کی ایک منزل تھی۔ یونیورسٹی کا کیمپس بہت جلد ایک دل کش باغ بن گیا لیکن خود ڈاکٹر صاحب معلوم ہوتا تھا کہ گلابوں کے عاشق ہیں طرح طرح کے خوب صورت پودے اور جھاڑیاں اور پھول دار درخت، مصوری کے کارنامے اور ارضیات کے لحاظ سے اہم پتھر اور فوسل FOSSILS جمع کرنے میں مشغول ہیں جرمنی میں وہ کمپوزیٹر کا کام اور خوش نما طباعت اور جلد سازی کا گر سیکھ چکے تھے اور یہیں انہوں نے موسیقی اور جدید آرٹ کا ذوق پیدا کیا تھا۔ انہوں نے کسی پرانے شوق کو چھوڑا نہیں تھا بلکہ لکھنے میں بھی رہے تھے اگرچہ لکھنے کا عمل انہیں ناقابل برداشت معلوم ہوتا تھا۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ زندگی کے ہر موڑ پر انہوں نے شوق کی چیزوں میں کوئی نہ کوئی اضافہ کیا اور ہر شوق معلوم ہوتا تھا کہ پرانا ہے اور اس سے دل بستگی کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے خود اسے اپنے لئے منتخب کیا ہے۔ جب کبھی وہ ایک مقام سے گئے ہیں تو اپنی یادگار کے طور پر ایک باغ چھوڑ گئے ہیں

ڈاکٹر ذاکر حسین سے جو بھی ملتا تھا اس پر ان کی تہذیب اور ان کے انکسار کا فوراً اثر پڑتا تھا۔ ایسی بات کہنا جس سے کسی کے دل کو دکھ ہو یا کوئی ناگواری ہو انہوں نے اپنے اوپر حرام کر رکھا تھا اور اسی وجہ سے لوگ انہیں اپنی غرض کی خاطر ستاتے رہتے تھے ڈاکٹر ذاکر حسین اپنی شکست تسلیم کرنے کو تیار رہتے تھے اگر ان کی شکست میں تہذیب کی فتح ہو سکے۔ نہ صرف انہیں باتوں میں تھا جنہیں سیاست گری کی زبان میں جزئیات کہتے ہیں، بڑے معاملوں میں وہ اپنی ہمت کو تہذیب کی زرہ بکتر پہنا کر بڑے سے بڑے مقابلے کو تیار رہتے تھے ان کا خلوص ان کو اس کی اجازت نہیں دیتا کہ آدمیوں کو یا تصورات کو شطرنج کے مہرے بنائیں ان پر ہر شخص بھروسہ کر سکتا تھا ایسا شخص بھی جو علانیہ ان کا مخالف ہو۔ لیکن کوئی دوست ہو یا مخالف وہ اس بھروسے کی وجہ سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا ڈاکٹر ذاکر حسین میں ایسی انصاف پسندی تھی جو انہیں مجبور کرتی تھی کہ ہر معاملہ کا دوسرا رخ بھی دیکھیں اور دیکھنے پر جو چیز ان کو نظر آتی تھی اسے وہ نظر انداز نہیں کرتے

ڈاکٹر ذاکر حسین کو جو بھی دیکھتا تھا وہ محسوس کرتا تھا کہ وہ اتنے قد آور ہیں جتنا کہ ایک مرد آدمی کو ہونا

چاہیئے لیکن وہ اپنی قامت کی بلندی کو پوری طرح ظاہر نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے ایک عمل کے میدان میں جو علم اور تجربہ حاصل کیا اس عمل کا میدان بدلنے کے بعد بھول نہیں گئے ان کے عمل کا میدان بدلتا رہا لیکن ان کی شخصیت جیسی تھی ویسی ہی رہی اور اسی طرح ہر نئے میدان میں وہ تازگی اور جدت کا نمونہ بن کر آئے۔ وائس پریسیڈنٹ کی حیثیت سے ان کی جن غیر ملکی نمائندوں اور اعلیٰ عہدیداروں سے ملاقاتیں ہوتی رہیں وہ اکثر یہ دیکھ کر بہت خوش اور متاثر ہوتے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین ان کے یہاں کے پھولوں، درختوں اور پتھروں کے بارے میں ایسی بات جانتے ہیں جو خود انہیں معلوم نہیں۔ ایک مرتبہ انہوں نے برما کے وزیر اعظم سے ایک پھول دار درخت کا ذکر کیا جو برما میں ہوتا ہے اور جس کا نام وزیر اعظم نے نہیں سنا تھا۔ تیونس میں وہ ایک جلوس کے ساتھ جا رہے تھے جب انہوں نے دیکھا کہ راستے کے دونوں طرف انار کے ننھے منے درختوں کا حاشیہ ہے وہ فوراً رک گئے اور جب تک انہیں یہ نہیں معلوم ہو گیا کہ انار کی یہ قسم کیسے پیدا کی جاتی ہے اور کیسے پھیلائی جاتی ہے وہ آگے نہیں بڑھے۔ یونان کے بادشاہ سے انہوں نے یونان کے مختلف قسم کے سنگِ مرمر پر گفتگو کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ یونان نے ایک بہت خوش نما ڈبے میں یونان کے سنگ مرمر کے مختلف نمونے بھیجے سوویت روس کے سائنس دانوں سے ملاقات ہوئی جنہوں نے دیکھا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کو معدنیات کے عجائبات سے بہت دلچسپی ہے تو انہوں نے واپس جا کر کوہ اورال کے مختلف رنگین کرسٹل پتھروں کا درخت بنا کر بھیجا جو ڈاکٹر ذاکر حسین کے ڈرائنگ روم میں رکھا رہتا تھا۔ غیر ملکی عمائدین سے سیاسی گفتگو کی تمہید کے طور پر اگر علم و شوق کی باتیں ہوں تو دوستی کی ایک فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ اور گفتگو کا نتیجہ اتفاق رائے ہو یا اختلاف رائے۔ اپنے اور غیر میں ایک خالص انسانی رشتہ ضرور قائم ہو جاتا ہے۔

میں نے یہ مضمون اس ارادے سے لکھنا شروع کیا تھا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کا چہرہ مرتب ہو جائے لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ چہرہ کیا جا کر بھی نہ بن سکا۔ مگر نقش میں صفائی کیسے آ سکتی ہے جب دل میں یہ محسوس ہو کہ یہ صفائی ہی نقش کو حقیقت کے خلاف کر دیتی ہے۔ کسی صفت کو وثوق کے ساتھ کیسے بیان کیا جائے جب ساتھ ہی یہ محسوس ہوتا ہے کہ کسی ایک صفت پر نظر کو قائم کیا جائے تو خصوصیتوں اور اوصاف کا جو مجموعہ ہے اس کی صحت میں فرق آ جاتا ہے میں نے کئی مرتبہ اس کی کوشش کی ہے کہ صاف صاف اور پیچ دار سوال کر کے، ایک نقاد کے انداز سے جسے تنقید کا اعزاز دیا گیا ہو یا ایک بے تکلف دوست کی طرح معلوم کروں کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے عقیدے کیا ہیں یا ان معاملات میں جنہیں دینی یا روحانی کہا جاتا ہے، ان کا رویہ یا نقطۂ نظر کیا ہے۔ لیکن انہوں نے ہمیشہ کوئی لطیفہ بیان کر کے یا ایسی بات کہہ کر جسے وہ جانتے تھے کہ میں صحیح نہ سمجھوں گا مجھے خاموش کر دیا۔ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ اس لگاؤ کی تہہ میں جو قومی تعلیم قومی سیرت اور

پھر اس خصوصیت سے جو ایک اچھے شہری اور مہذب انسان میں ہونا چاہیے ایک توکل ہے جو تمام موجودات کو اور تمام معاملات کو بے حقیقت سمجھتا ہے اور ایسے ہی میں نے اکثر محسوس کیا ہے کہ اس توکل کی تہہ میں ایک بے چینی ہے جو کسی وقت بھی شعلہ بن کر نکل سکتی ہے۔ اس توکل اور بے چینی میں کوئی تضاد نہیں ہے اس لئے کہ یہ توکل کسی منطقی استدلال کا کسی غور و فکر یا زندگی کے تجربات کا نتیجہ نہیں ہے یہ ایک پرتو ہے دل کی قوت کا ایک اثر اس صبر کا جس کے بغیر ایمان پختہ نہیں ہوتا اور امید یقین سے محروم رہتی ہے۔ دوسری طرف جو بے چینی ہے وہ کسی ایک نقطے پر تمام قوتوں کے یکجا ہو جانے کا نتیجہ ہوتی ہے یہ مختلف میلانات جن کی جڑیں طبیعت کی گہرائی تک پہنچتی ہیں کس طرح ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت میں ہم آہنگ ہوتے تھے اور ان کی گفتگو اور عمل میں ظاہر ہوتے تھے فطرت اور تہذیب کا ایک معمہ ہے اور ہمیں سمجھ لینا چاہئیے کہ معمہ رہے گا۔ اسے اس طرح بیان نہیں کیا جا سکتا کہ وہ حل ہو جائے۔ اس کی ایسی تشریح نہیں کی جا سکتی کہ ہم ہر محرک کو الگ کر سکیں یعنی آخر میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ الفاظ کو جوڑ کر ڈاکٹر ذاکر حسین کا خاکہ مرتب نہیں کیا جا سکتا

"اکثر استادوں کے بھیس میں ایسے کاریگر ہوتے ہیں جن کی ساری عمر کی کوشش سے کچھ جھوٹے ریاکار خود دیکھنے میں تو بہت اچھے مذہبی اور اخلاقی لوگ ہیں پیدا ہوتے ہیں مگر ان کے نیک عمل کی جڑیں ان کے دل تک نہیں پہنچتیں۔ یہ لوگ جھوٹے مال پر اچھے کارخانے کا ٹھپہ لگا دینا کافی سمجھتے ہیں اور اصل دھات کو بدلنے کی جگہ ملمع کر دینے پر راضی ہو جاتے ہیں"

(ڈاکٹر ذاکر حسین)

ذاکر صاحب ـــــ ایک معلم

ڈاکٹر محمد اکرام خاں، لکچرر

کچھ دن کم چار سال پہلے ذاکر صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں لیکن اُن کے غم کا داغ کسی صورت ہلکا ہوتا نظر نہیں آتا ہے بلکہ کچھ ایسا لگتا ہے کہ وقت گزرتا رہے گا اور ذاکر صاحب کی جدائی کا غم شخصی اور قومی زندگی کے ہر موڑ پر اُس شخص کو خون کے آنسو رلائے گا جس کا کسی نہ کسی عنوان ذاکر صاحب سے تعلق رہا ہو آج سے کے سب لوگ ذاکر صاحب کو اچھی طرح جانتے ہیں بہتوں نے اُن کو دور اور نزدیک سے اچھی طرح دیکھا ہے بہتوں نے ان کے ساتھ کام کیا ہے بہتوں نے ان کی رہنمائی اور ہدایت کے مطابق اپنے فرائض منصبی کو بحسن انجام دیا ہے بہتوں نے اپنی زندگی ان کی ماں اور باپ جیسی شفقت سے سجائی اور سنواری ہے بہتوں نے ان کی سرپرستی اور نگرانی میں تعلیم حاصل کی ہے مجھے ان کے ایک حقیر شاگرد ہونے کا فخر حاصل ہے میں نے اُن کو سدا ایک معلم کی حیثیت سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

یوں تو ذاکر صاحب ہمارے درمیان نہیں ہیں، لیکن ان کی تحریروں اور تقریروں، ان کے افکار اور کردار، اُن کے اُصولوں اور قدروں کا بیش بہا خزانہ قوم کے تعلیمی خزانوں میں محفوظ ہے نئی نسلوں کے لوگ اس محفوظ خزانہ کے ذریعہ ذاکر صاحب کو جانیں گے، ذاکر صاحب کو سمجھیں گے، ذاکر صاحب کو پڑھ کر اپنے لئے آگے کی راہ تلاش کریں گے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہر شخص اس خزانہ سے براہ راست فیض یاب نہیں ہو سکے گا۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ تحقیقاتی کام کرنے والے لائق اور اہل قلم حضرات ذاکر صاحب کے علم و فضل کی گہرائی ان کی مذہبی اور فلسفیانہ نظر، اُن کے اسلوب بیان اور طرز تحریر و تقریر، ان کے اُصول تعلیم اور طریقۂ تعلیم ان کی سیرت کی بلندی اور وقار، ان کی سیاسی سوجھ بوجھ اور حسن انتظام، ان کی حق پرستی اور انصاف پسندی اُن کی انسان دوستی، اور دیش بھگتی، ان کی خدمت اور ایثار، ان کی دلچسپی اور ذوق کا تفصیلی مطالعہ کریں اور تاریخ کو اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ دوسروں تک پہنچائیں۔ اس طرح نئی نسلیں ذاکر صاحب سے فیض یاب ہو سکیں گی۔

ڈاکٹر صاحب نے زندگی بھر اپنے وطن عزیز کی خدمت کی ہے خدمت ان کا وظیفہ زندگی تھا۔ انہوں نے ایک معلّم کی حیثیت سے قومی خدمت کے میدان میں قدم رکھا اور صدر جمہوریہ کی حیثیت سے اس سفر کو ختم کیا اور بالآخر اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی (خدا اُن کو اپنی رحمتوں سے مالا مال فرمائے) ۱۹۲۰ء سے ۱۹۶۹ء تک ڈاکٹر صاحب نے اَن گنت طریقوں اور حیثیتوں سے قومی خدمت کے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں لیکن انہوں نے اپنی معلّم کی حیثیت ہر قدم پر باقی رکھی ہے۔ اس حیثیت پر ہمیشہ فخر کیا ہے۔ شاید اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان کے دل کو سکون اور قرار اسی حیثیت میں زیادہ حاصل ہوا ہے۔ معلّم کی حیثیت سے انہوں نے صحیح معنوں میں صحیح اور صالح قدروں کی اشاعت اور قومی کردار کی تشکیل کی ہے اکتوبر ۱۹۵۴ء میں جے پور میں استادوں کے اجتماع کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"میں دل سے آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اس جلسے کے موقع پر مجھے یاد فرمایا۔ آدمی کو شاید سب سے زیادہ خوشی اس سے ہوتی ہے کہ اس کی برادری کے لوگ اسے پسند کریں میری برادری یہی شکشکوں کی برادری ہے میں نے آج سے کوئی ۲۴ ۲۵ برس پہلے اس کام کو اپنایا تھا اور اس لمبی مدت میں کبھی مجھے ایک آن کو یہ افسوس نہیں ہوا کہ میں نے یہ کام کیوں لیا خاص مشکلوں میں مجھے یہ کام کرنا پڑا شکشا کو نئے ڈھنگ پر ڈالنے کی کوشش میں لوگوں کی مخالفت بھی سہنی پڑی اور مخالفت کی گرمی سے زیادہ بے پروائی کی ٹھنڈی مار بھی پڑتی رہی مگر جی نے سکھ اسی کام میں پایا اور ساتھیوں اور شاگردوں کی محبت نے سب تکلیفوں کو بھلا دیا۔ آپ کا آج مجھے بلانا بھی انہیں تکلیفوں کا انعام ہے سچ یہ ہے کہ دیا کم ہے پایا زیادہ ہے،

بار اٹھانے میں جفائیں تو اٹھائیں لیکن

لطف بھی ایسا اٹھایا ہے کہ جی جانے ہے

میں نے جب شکشا کے میدان میں قدم رکھا تھا تو وہ ہماری غلامی کا زمانہ تھا۔ ہم ایک پردیسی راج کی ایڑی تلے دبے ہوئے تھے۔ سامراج کی رسیوں میں جکڑے ہوئے تھے پر وہ گری نے جیسی اور ہلچل کا زمانہ بھی تھا۔ ہم غلامی کی رسیاں توڑنے میں اپنا سارا زور لگا رہے تھے ان رسیوں کو کاٹنے کی کوشش میں راشٹری شکشا کی کوشش بھی تھی۔ یہ ایک کمزور سی کوشش تھی میں بھی دوسرے ساتھیوں کے ساتھ اس میں لگ گیا۔"

ڈاکٹر صاحب تعلیمی آدمی تھے۔ انہیں درس و تدریس میں لطف آتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے زندگی کا بہترین اور بیشتر حصہ معلّم کی حیثیت سے گزارا ہے۔ وہ اسی حیثیت سے اپنا مقصدِ حیات حاصل کرنا چاہتے تھے اور ہاں انہیں اسی میں اپنا مقصدِ حیات حاصل ہوا ہے۔ علی گڑھ سے چلے آنے کے بعد کچھ تصنیف و تالیف کا کام کرنا چاہتے تھے کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے انہیں راجیہ سبھا کا ممبر بنادیا اور پھر ان کی عدم موجودگی ہی میں ان کو

ریاست بہار کا گورنر مقرر کر دیا گیا ظاہر ہے ڈاکٹر صاحب سے مشورہ صرور کیا گیا ہوگا۔ لیکن ایک مبارکباد کے خط کے جواب میں انہوں نے ۲۳ جون ۱۹۵۷ء کو برسوں سے اپنے ایک شاگرد کو جو خط لکھا تھا وہ ذیل میں درج ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ گورنری کا عہدہ قبول کرتے وقت ڈاکٹر صاحب کے اصل جذبات کیا تھے

"مبارکباد پر کیا لکھوں، کسی کو کوئی چیز بلا استحقاق مل جائے اور اس کا چرچا ہو تو وہ بے چارہ سوائے اس کے کہ شرمندہ ہوا کرے، لیکن آپ خوش ہیں اس لئے میں بھی خوش ہوں۔ کام میری ساری پچھلی زندگی سے لگا نہیں کھاتا ہے۔ لیکن انکار مناسب نہ تھا۔ دعا کیجئے کہ لاج رہ جائے۔ مگر آپ نے تو بہت سی امیدیں قائم کر لی ہیں۔ بستی بسا کھیل نہیں۔ بستے بستے بستی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے بحیثیت معلّم کئی طور پر ان گنت نوجوانوں کی زندگیاں علم کی روشنی سے منور کی ہیں۔ انہیں اپنے شاگردوں سے بے پناہ اور مستقل محبت تھی ان کے یہاں استاد اور شاگرد کا رشتہ دائمی رشتہ سمجھا جاتا تھا وہ اپنے شاگردوں کی مدرسوں اور کالجوں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد بھی ہر آڑے وقت میں مدد فرماتے تھے۔ شاید ان کے دل بے قرار کو قرار ہی شاگردوں سے مل کر اور ان کی رہنمائی کر کے ملتا تھا۔ ایک خط کا ضروری حصہ ذیل میں درج ہے۔ یہ خط ڈاکٹر صاحب نے ۲۳ مئی ۱۹۵۹ء کو راج بھون رانچی سے اپنے ایک شاگرد کے خط کے جواب میں لکھا تھا۔

"آپ نے اپنی جو سرگزشت لکھی ہے اس سے رنج ہوا اور اپنی بے بسی پر اس سے زیادہ رنج، یہاں کسی باہر کے آدمی کے لئے تعلیمی کام کا ملنا مشکل ہے جس سے اپنا موجودہ کام سنبھالا ہے تو جو سفارشی خط لکھنا ترک کر دیا ہے۔ اب اگر کوئی مجھ سے کسی کے متعلق رائے دریافت کرتا ہے تو لکھ دیتا ہوں۔ لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مجھ سے دریافت نہیں کیا جاتا سفارش سے زیادہ مفید ایک مشورہ آپ کو دینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ ہر آدمی کی زندگی میں ایک نہ ایک وقت آزمائش کا ہوتا ہے بانصیب اس سے اپنی بہترین صفات کی تربیت کا کام لیتے ہیں، بے نصیب تقدیر سے لڑتے ہیں اور اپنے دل کی تلخی سے اپنی زندگی خراب کرتے ہیں۔ خارجی دنیا صیبی کی تلخی رہتی ہے اور یہ غریب بگڑ جاتے ہیں۔ اپنی مشکلوں سے اپنے اندر تلخی پیدا نہ ہونے دیجئے۔ وقت کی اچھی صفتوں میں یہ بھی ہے کہ گزر جاتا ہے۔ اچھا ہی نہیں، برا بھی۔"

مجھے معلوم ہے کہ ڈاکٹر صاحب مذکورہ بالا خط لکھنے کے بعد اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے جب تک اپنے اس شاگرد کو دہلی کے ڈائرکٹر آف ایجوکیشن سے کہہ کر یا کہلا کر ایک گورنمنٹ اسکول میں استاد کی حیثیت سے ملازم نہیں کرا لیا یہ اس لئے لکھ رہا ہوں کہ وہ صرف نصیحت ہی نہیں کرتے تھے بلکہ صحیح معنوں

میں ضرورت مندوں کی ضرورت بھی پوری کرتے تھے۔

قومی نقطۂ نظر سے دیکھیے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب ہماری پوری قوم کے استاد تھے انہوں نے ملک کی آزادی اور قوم کی ترقی کے لئے قومی تعلیم کا ایک مکمل خاکہ بنیادی قومی تعلیم کے نام سے پیش کیا تھا۔ انہوں نے جامعہ میں قومی تعلیم کا نصاب تیار کیا اسے برتا اور پھر اس کے لئے ایک طریقۂ تعلیم تجویز کیا۔ اُن کی تقریروں اور تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کام کے ذریعہ تعلیم کو کتنی اہمیت دیتے تھے اور کیوں کام دراصل ان کے نزدیک تعلیم آدمی کے ذہن کی پوری پوری پرورش کا نام ہے اور وہ یہ پرورش کام کے ذریعہ تعلیم دے کر کرانا چاہتے تھے۔ ۲۵ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو پٹنہ سے ایک خط میں بڑی حسرت کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں:-

"لیکن بنیادی تعلیم کو لوگ نہ نظری طور پر سمجھتے ہیں، نہ اُس کا عملی مظاہرہ ہی بہت اچھا ہو رہا ہے۔ بڑی محنت کا کام ہے یہ۔ ملک کا بڑا محسن ہوگا جو اسے کر ڈالے۔ نہ جانے یہ سعادت کس کے نصیب میں ہوگی!"

ذاکر صاحب کی ذات میں اچھے استاد کی تمام تر خوبیاں اور صفات موجود تھیں وہ عالم باعمل تھے۔ وہ سماجی آدمی تھے۔ وہ سب کا ادب کرتے تھے بڑوں کا بھی ساتھیوں کا بھی، بچوں کا بھی، اور سب سے بڑی، بات تو یہ کہ اپنا بھی، وہ صابر تھے اور مستقل مزاج وہ کتابوں کے عاشق تھے وہ حساس تھے اور بے حد ذہین تھے انہیں بچوں سے والہانہ محبت تھی۔ وہ دوسروں پر یقین رکھتے تھے غرض یہ کہ ان میں ایک اچھے استاد کی ہر صفت بدرجہ اتم موجود تھی لیکن ذاکر صاحب کی سب سے زیادہ نمایاں اور قابلِ ذکر خوبی اور صفت یہ تھی کہ وہ شاگردوں کی بننے والی شخصیت کا رخ پہچان کر نہ صرف اس کی ترقی کے امکانات کا اندازہ کرتے تھے بلکہ اسے درجۂ کمال تک پہونچانے میں ہر ممکن مدد کرتے تھے۔

ذاکر صاحب ہر شخص سے بالخصوص اپنے شاگردوں سے ماں کی طرح غیر مشروط محبت کرتے تھے معلم کی حیثیت سے اُن کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ لوگوں کی سیرت کے بُرے پہلوؤں کو نظر انداز کرتے اور اچھے پہلوؤں کو ڈھونڈھ نکالتے تھے۔ ان کی کچھ اس طرح قدر و ہمت افزائی کرتے تھے کہ انہوں نے ہزاروں گرتوں کو تھاما ہے اور ہزاروں کو بھٹکنے سے بچایا ہے۔ اس سلسلے میں حسب ذیل خط ملاحظہ فرمایئے جسے انہوں نے "بچوں کا گھر" دریا گنج دہلی کے ایک سولہ سالہ طالب علم کے ایک خط کے جواب میں "گھر" کے نگراں کو راج بھون پٹنہ سے ۱۵ اکتوبر ۱۹۶۱ء کو لکھا تھا۔

"محبی فاروق صاحب، السلام علیکم

خلیل میاں (مالو) کا ایک خط مجھے ملا۔ اس میں انہوں نے یہ لکھا ہے کہ وہ یہ خط آپ کی اور حکیم صاحب کی ہدایت کے مطابق لکھ رہے ہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ انہیں نہیں لکھ رہا ہوں آپ ہی کو لکھتا ہوں۔ اگر خط انہوں نے آپ کی ہدایت پر ہی لکھا ہو تو انہیں میری رائے بتا دیجئے گا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ میں شادی کے بارے میں کسی سے گفتگو نہیں کر سکوں گا نہ پٹنہ میں نہ کہیں اور مالو نے پٹنہ میں کسی صاحب کی والدہ کا نام لکھا ہے۔ میں ان سے گفتگو کرنے سے معذور ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ میری رائے میں شادی کرنے سے پہلے میاں خلیل کو برسرروزگار ہونا چاہیے۔ سوائے اس کے کہ کوئی دلہن انہیں ایسی ملے جو انہیں پالنے پر تیار ہو اور برابر پالتی رہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر شادی کا ارادہ مصمم کر لیا ہے تو صاحبزادے کو انتخاب میں بدیہی غلطی سے بچانے میں آپ، حکیم صاحب اور اکرام صاحب ان کی مدد فرمائیں۔ آگے ان کی مرضی اور خدا کی مرضی۔"

اس تذکرہ سے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت، اُن کی بڑائی اور ان کی تعلیمی خدمات کا صرف دھندلا سا اندازہ ہوتا ہے ورنہ حقیقتاً ان کا ذکر تو ان کے دوستوں اور ساتھیوں کے قلم کی زبان سے سننے میں لطف آتا ہے۔ اُن کی بڑائی کا اندازہ سچ پوچھیے تو ان تحریروں سے ہوتا ہے جو ملک کے باوقار اور قابل ذکر اشخاص کی ہیں۔ مثلاً خواجہ غلام السیدین مرحوم جو خود بھی ایک کامیاب [illegible] دیکھئے اور جن کی شخصیت ایک حسین اور موزوں ترین مجموعہ تھی جامعیت، کلیت اور انفرادیت کا انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے ایک خطبۂ صدارت کو پڑھنے کے بعد انہیں لکھا تھا۔

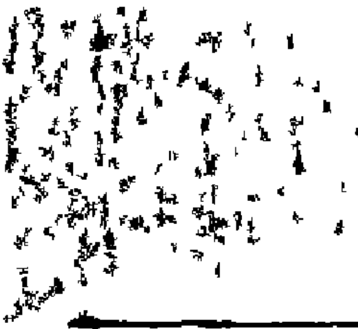
"حبیب محترم

ہوائی جہاز کا سفر اور قلم اتنا اشتاں اس لئے قلم سرمہ سے لکھنے کی معافی چاہتا ہوں۔ اس سفر کے دوران میں علی گڑھ کا خطبۂ صدارت پڑھا خلق الانسان علمہ البیان اور علی گڑھ گزٹ کا ذاکر نمبر دل عقیدت سے لبریز ہے اور آنکھیں پُرنم اور قدرت سے یہ شکایت کہ جب وہ ایسی تخلیق کر سکتی ہے تو ہم جیسے خس و خاشاک پر طبع آزمائی کی زحمت کیوں فرمائی؟

آپ کا

سیدین"

8 3 57



ڈاکٹر صاحب کا شوق باغبانی

اکرام احمد (لکچرر)

"ڈاکٹر صاحب کو کن باتوں سے دلچسپی ہے اس کا پتہ لگانا آسان ہے اس لئے کہ ان کو ہر چیز سے دلچسپی ہے، کم لوگ ایسے دیکھے گئے ہیں جو اپنے گرد و پیش اور نزدیک و دور کی ہر طرح کی معمولی و غیر معمولی چیزوں اور باتوں سے اتنی بھرپور دلچسپی رکھتے ہوں جتنی کہ وہ باغبانی سے ان کو عشق تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا مکان بہت مختصر لیکن صفائی، سادگی اور سلیقے کا نمونہ تھا۔ ایک بار کریلے کی کیاری پر ہریالی چھا رہی تھی ڈاکٹر صاحب اسے متاثر ہوئے کہ کام چھوڑ کر کافی دیر وہاں کھڑے رہے اور کہنے لگے کیسی بہار آرہی ہے اُس وقت بھی ہندوستان میں یونیورسٹیوں اور اچھے اداروں کی کمی نہ تھی لیکن شاید ہی کہیں باغ ہو ڈاکٹر صاحب پہلے شخص ہیں جنہوں نے محسوس کیا کہ تعلیم کی طرح باغبانی بھی ایک تخلیقی فن ہے چنانچہ جامعہ کے مدرسوں میں اسے ایک مستقل نصابی مضمون کی حیثیت دی گئی۔ طلباء خوش خوش اپنی کیاریوں میں کام کرتے قرینے سے گملے بھرتے اور سجاتے باغبانی سے جو آمدنی ہوتی وہ نصف طلباء کو ملتی اور نصف ادارے کو۔ ۱۹۲۹ء کی جامعہ کی عمارتوں میں جس سلیقے کی تنظیم اور نفاست کو دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ یہاں بے سروسامانی کا دور دورہ ہے۔

جب جامعہ نگر کی عمارتوں کے نقشے بنے شروع ہوئے تو سب سے پہلے باغات کے لئے وسیع خطے محفوظ کر دیئے گئے عمارتوں کے لئے روپیہ کم تھا ایسے میں باغ پر خرچ کرنے کے لئے پیسہ کہاں سے آتا۔ پھر زمین پتھریلی پانی نایاب جامعہ میں سوائے ببول کے اور کچھ نہ تھا۔ باغ لگانے کا حوصلہ کسی طرح پست نہیں ہوا۔ میدانوں کے چاروں طرف مکانوں کی چہار دیواری کے سہارے بوگن ویلیا کی قطاریں لگوادیں بوگن ویلیا کے متعلق ڈاکٹر صاحب فرماتے انہیں پانی کم دو تو ان میں پتیاں کم اور پھول زیادہ آئیں گے۔

پرائمری اور سکنڈری اسکولوں کے درمیان بڑے بڑے لان اور پھول لگائے گئے تھے جہاں پہلے

کبھی دھول اُڑتی تھی وہاں اب گلاب کی کیاریاں بن گئیں بہار کے موسم میں سارا میدان رنگوں سے بھر جاتا ڈاکٹر صاحب جب کبھی ہندوستان سے باہر جاتے اپنے ساتھ گلاب کے پودے ضرور لاتے اور اپنی نگرانی میں جامعہ میں لگواتے۔ اُن کے زمانے میں جامعہ میں نہایت حسین گلزار تھے۔

اپنے اس شوق اور توجہ کی بنا پر وہ معمولی معمولی مالیوں کو اپنے مطلب کا سا بنا لیا کرتے اور ان میں کام کا شوق پیدا کرتے اور انہیں محنت کا عادی بنا دیا کرتے جامعہ کے ابتدائی دور میں فقیرا نامی ایک مالی تھا جو باغبانی کا سارا کام کرتا تھا جاڑا ہو یا گرمی تیز اسے کام میں صبح سے شام تک لگا رہتا تھا جامعہ کے تمام کارکنوں میں ڈاکٹر صاحب فقیرا مالی کی بہت تعریف کرتے تھے

انہوں نے گل مہر کے درختوں کی قطار اپنے مکان کے سامنے اور استادوں کے مدرسے کو جانے والی پوری سڑک پر لگوائی گرمیوں میں سارا راستہ سرخ سرخ پھولوں سے نہایت خوشنما معلوم ہوتا ہے اس سڑک کا نام اب گل مہر ایوینیو ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو کیکٹس (ناگ پھنی) کی مختلف قسموں کے جمع کرنے اور پہاڑیاں (راکری) بنا کر ان میں کیکٹس کے پودے لگانے کا بہت شوق تھا انہوں نے جامعہ نگر میں اپنے مکان کے باغیچے کے ایک کونے میں کیکٹس کی ایک بہت خوبصورت راکری بنائی تھی اس میں کئی اقسام کی ناگ پھنیاں لگی ہیں

ناگ پھنی لگانے کا شوق اب بہت عام ہو گیا ہے لیکن جس خوبی اور سلیقے سے ڈاکٹر صاحب نے اپنی پہاڑی کو ترتیب دیا تھا ایسی پہاڑی دیکھنے کو کم ملے گی ناگ پھنی کے پودوں کو ان کی شکل، ان کی رنگت، اُن کے قد اور اُن کے میلان کو مدنظر رکھ کر لگایا گیا تھا اس بات کا بھی خیال رکھا گیا تھا کہ ہر کیکٹس کے پودے کی زمین ایسی خوبصورت اور عجیب پتھروں سے ترتیب دی جائے کہ پودے کے ساتھ جگہ بھی نکھر جائے۔

اُن کا ذوق کسی مکان تک محدود نہیں رہتا وہ جہاں رہتے وہاں کے سارے ماحول اور گرد و پیش پر چھا جاتا۔

پھولوں کے ساتھ ساتھ ان کو پھلوں کا بھی شوق تھا۔ پپیتے کے بیج نہ جانے کہاں کہاں سے منگواتے اور مختلف لوگوں کو ان کے لگانے کی ہدایت کرتے۔ آم بھی انہیں بہت پسند تھے لیکن جامعہ کی زمین آموں کے لئے کچھ موزوں نہیں تھی پھر بھی اپنے مکان کے صحن میں انہوں نے قلمی آم کا پودا لگایا۔ لیمو کے درخت لگائے۔ ان کے لئے جامعہ نگر کی زمین موزوں تھی

جامعہ سے چلے جانے کے بعد بھی وہ اس کو بھولے نہیں۔ اکثر پودے بھجواتے رہتے تھے انہوں نے

ایک بار عمدہ قسم کے ناگوری کے پودے بھیجے اُن میں سے کچھ ڈیپارٹمنٹ آف ایڈ گرانٹس کے باغ میں پھل رہے ہیں۔ کچھ کلام صاحب نے اہل جامعہ میں تقسیم کر دیئے دیودار کے درخت بھی ڈاکٹر صاحب کے بھیجے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی نظر ایک ایک پھول اور پودے پر رہتی تھی مجال نہیں جو کوئی پودا مرجھایا مواد کھائی دے یا کوئی کیاری صاف نہ رہے۔ ان کی دیکھا دیکھی ان کے رفقاء اور جامعہ کے اساتذہ اور کارکنان میں بھی باغبانی کا شوق پیدا ہو۔ پروفیسر مجیب صاحب کرنل بشیر حسین زیدی صاحب اور حامد علی خاں صاحب مرحوم کو ڈاکٹر صاحب ہی نے باغبانی کی طرف مائل کیا۔ ان کے علاوہ سید مجتبیٰ حسین زیدی صاحب محمد حبیب صاحب (اکاؤنٹ آفیسر جامعہ) اصغر احسن اصلاحی صاحب (استاد مدرسہ ابتدائی) عتیق احمد صاحب مرحوم اور ابوالکلام صاحب کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔

جب ڈاکٹر صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے تو وہاں ہر طرف دھول اڑ رہی تھی ڈاکٹر صاحب کی توجہ سے نہ صرف عمارتوں کے گرد و پیش میں رنگیں اور شاداب بیلیں لہلہانے لگیں انہوں نے یونیورسٹی کے گوشوں میں گلاب کی کیاریاں لگوائیں اسٹاف کے لوگوں کے لئے بھی اپنے گھر میں گلاب لگوانے کا شوق پیدا ہوا۔ یونیورسٹی میں ہر سال گلابوں کی نمائش کا سلسلہ شروع ہوا جو اب بھی جاری ہے

گلاب کے علاوہ یونیورسٹی میں لوگس ڈیلیا کا بھی کثرت سے رواج ہوا آج بھی ہر طرف اس کی بہار نظر آتی ہے

پروفیسر حبیب الرحمٰن نے لوگس ڈیلیا کے مختلف رنگ تخلیق کئے جن کی شہرت علی گڑھ کے باہر تک جا پہونچی۔ انہوں نے لوگس ڈیلیا کی ایک تخلیق کا نام "ڈاکر پاما" رکھا ہے۔

بقول پروفیسر محمد مجیب "یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ زندگی کے ہر موڑ پر انہوں نے شوق کی چیزوں میں کوئی نہ کوئی اضافہ کیا ہے اور ہر شوق معلوم ہوتا تھا کہ پرانا ہے اور اس سے دلبستگی کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے خود اسے اپنے لئے منتخب کیا ہے۔ جب کبھی وہ ایک مقام سے گئے ہیں تو وہ اپنی یادگار کے طور پر ایک باغ چھوڑ گئے ہیں۔

۱۹۵۹ء میں ڈاکٹر صاحب بہار کے گورنر مقرر کئے گئے۔ پٹنہ کا راج بھون ان کو تنکا کا گاہ لگتا تھا۔ وہ راج بھون ہے جس کی آرائش پر صوبائی حکومت پانی کی طرح روپیہ بہایا کرتی ہے لیکن روپیہ ہی تو تزئین و آرائش کے لئے کافی نہیں ہے۔ اس کے لئے اعلیٰ ذوق اور تجسس بھی ضروری ہے۔ اور یہ خوبیاں ہر ایک کے حصے میں کہاں آتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب جب راج بھون پہنچے ہیں تو سب سے پہلے باغ کی طرف دھیان جاتا ہے اور اپنے ایک پیارے مددگار محمد اکرام خاں کو خط لکھتے ہیں۔

راج بھون

۱۸ اکتوبر ۱۹۵۹ء

محبی اکرام صاحب تسلیم!

یہ خط ایک رحمت دینے کو لکھا ہے اور یہ بھی درخواست ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اب کے جو دہلی آؤں تو وہاں سے کچھ گھاس ساتھ لاؤں۔ کھانے کے لئے نہیں بلکہ لان پر لگانے کے لئے۔ ایک بہت اچھی گھاس نئی دلی میں چلی ہے۔ شاہد سعیدہ نے وہاں کے اندر بھی لگی ہے سنا ہے یہ نئی گھاس گاندھی سمادھی پر لگی ہے۔ اس کا پتہ یا تو نظام الدین کی پاس والی نرسری میں لگے گا یا پھر گاندھی سمادھی پر اگر آپ میرے آنے تک معلوم کر رکھیں کہ کہاں ملتی ہے اور گھاس کھاؤ ملتی ہے تو تھوڑی سی اگر گراں ہو، اور ایک بورا اگر سستی ہو تو ساتھ لانا چاہتا ہوں اگر آپ کی مساعی ناکام ہوئیں تو پھر راشٹرپتی بھون کے باغ سے نوچ نوچ کر جیبوں میں بھرنی ہوگی اس خفیف الحرکتی سے بچنے میں مدد کیجئے۔

مخلص

ذاکر حسین

باغبانی کا شوق تو بہت سے لوگوں کو ہوتا ہے لیکن یہ شوق محدود دائرے تک رہتا ہے کسی کو پھلوں کے باغات لگانے کا شوق ہوتا ہے کسی کو پھول دار درخت لگانے کا۔ کسی کو گلاب کا، کسی کو لوکس ویلیا کا اور کسی کو موسمی پھول کا۔ ذاکر صاحب کا شوق ان سے بلند و بالا ہے۔ ان کو چمن کے ہر حصہ اور مکاں کے ہر گوشے سے دلچسپی ہے چنانچہ چند ہی دنوں میں انہوں نے راج بھون کی کایا پلٹ دی نئے سرے سے لان لگائے گئے۔ پھولوں کے لئے نئے انداز سے کیاریاں بنائی گئیں۔ انہوں نے راج بھون کو حسن سے حسین تر بنا دیا۔ ان کے زمانے میں پٹنہ کے راج بھون میں مختلف گلاب کی تین سو سے اوپر قسمیں تھیں۔

دیوگڑھ میں ایک صاحب بھٹاچارجی نامی گلابوں کے بڑے ماہر خصوصی ہیں۔ انہوں نے مختلف گلابوں کے میل سے نئے نئے رنگ تخلیق کئے ہیں، وہ پٹنہ کے راج بھون میں آئے تو ذاکر صاحب کے گلابوں کے شوق کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے چنانچہ پٹنہ سے واپس جاکر انہوں نے اپنی ایک تخلیق کا نام ذاکر حسین رکھا۔

بنگلور میں کروٹن نہایت عمدہ ہوتے ہیں وہاں کے ایک ماہر نے ذاکر صاحب کے پودوں اور پھولوں کے شوق کو دیکھ کر اپنی ایک تخلیق کا نام ذاکر حسین رکھا ہے۔

ہماچل کے سابق گورنر راجہ صاحب بھوری نے جو "گلے ڈیولیس" کے بڑے ماہر اور شوقین ہیں۔ اپنی ایک تخلیق کا نام ذاکر حسین رکھا ہے یہ ایک پھول دار درخت ہے جس کے پتے تلوار کی شکل کے ہوتے ہیں۔

ذاکر صاحب کے دوست احباب ان کو تحفے میں پھولوں کے بیج اور پودے لا لاکر دیا کرتے اس لئے کہ انہیں معلوم تھا کہ ذاکر صاحب کو اس سے جو خوشی ہوتی ہے وہ کسی اور تحفے سے نہیں ہوتی جیاپچا انگلستان فرانس، امریکہ اور جرمنی سے بیج اور پودے تحفے میں آئے ایک مرتبہ ڈاکٹر اکرام جمال صاحب نے امریکہ سے ان کو پودے بھیجنے کے لئے لکھا جواب میں ذاکر صاحب نے تحریر فرمایا۔

" ہاں اپنے ساتھ پودے نہ لایے اس میں بڑا جھگڑا ہے بیج بھیج دیجئے اور جب آئے تو درختوں کے بیج لیتے آئے اگر معلوم ہو سکا کہ کس درختوں کے بیج کار آمد ہوں گے تو لکھوں گا آپ کسی جاننے والے کو شامل مشورہ کر کے انہیں کہیں نہ کہیں سے حاصل کر لیجئے گا جامعہ میں ایک ایوینو کے لئے پودے تیار ہو جائے گی پھر لوگ اسے جلا کر مار تو دیں گے کیا عجب کوئی نہ کوئی سخت جان بچ نکلے اور بہار دے جائے اس وقت جب کسی کو یاد بھی نہ ہوگا کہ کون لایا تھا اور کس نے لگایا تھا یہ بھی ایک زندگی ہے"

نائب صدر جمہوریہ ہند کی حیثیت سے ذاکر صاحب کوٹھی نمبر ۶ مولانا آزاد روڈ نئی دہلی میں رہے اس کوٹھی میں پہنچتے ہی ذاکر صاحب نے اس کی کایا پلٹ دی LAYOUT بدل دیا، مکان کی آرائش اور سجاوٹ بدل دی۔ گملے رکھنے کے لئے TERRACES سوائے باغ اور لانوں کی نئے سرے سے تختہ بندی کی گئی غرض چند ہی مہینوں میں کوٹھی کا حلیہ ہی بدل دیا۔

معلومات حاصل کرنے میں بھی ذاکر صاحب کا جواب نہیں تھا۔ آپ ایک ماہرین سے لے کر ایک معمولی آدمی تک سے معلومات حاصل کرنے سے نہیں جھجکتے تھے جب کسی غیر ملک جاتے تو سب سے پہلے یہ معلوم کر لیتے کہ وہاں کے کون سے درخت، پھول اور BULBS مشہور ہیں نائب صدر کی حیثیت سے ان کی جن غیر ملکی نمائندوں سے ہوتی رہیں وہ اکثر یہ دیکھ کر بہت خوش اور متاثر ہوتے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کو ان کے یہاں کے پھولوں، درختوں، پتھروں کے بارے میں ایسی باتیں معلوم ہیں جن کو وہ خود نہیں جانتے۔

ایک مرتبہ وہ ٹیونس گئے بحیثیت نائب صدر ان کا جلوس ایک راستہ سے گزر رہا تھا راستہ کے دونوں طرف انار کے بیٹھے بیٹھے خوب صورت درخت لگے دیکھے آپ وہیں رک گئے اور جب تک انار کی اس قسم کی کاشت اور دیکھ بھال کے طریقے وغیرہ نہ جان لئے آگے نہ بڑھے۔

نائب صدارت ہی کے زمانہ میں ذاکر صاحب مصر تشریف لے گئے صدر جمال عبدالناصر کے محل

میں ان کا قیام تھا۔ محل میں یوکلپٹس کے خوب صورت درخت ذاکر صاحب کو بہت پسند آئے۔ انہوں نے صدر ناصر سے ان درختوں کے تھوڑے سے بیجوں کی فرمائش کی۔ صدر ناصر نے انہیں ایک کلو عمدہ بیج پیش کر دئے۔ ہندوستان واپس آکر انہوں نے آدھے بیج اسی کوٹھی کے لئے رکھے اور آدھے ابوالکلام صاحب کو دیئے اور کہا کہ ان کو اگائیے اور پودے لوگوں میں تقسیم کیجئے تاکہ جامعہ میں پھیلیں۔ چند ماہ بعد کرنل بشیر حسین زیدی صاحب ذاکر صاحب کے ہاں گئے تو انہوں نے اپنے یوکلپٹس کے پودے دکھائے اور بتایا کہ آدھے بیج میں نے کلام صاحب کو دئے تھے معلوم نہیں ان کے پودے کیسے ہوئے۔ زیدی صاحب نے کہا کہ ان کے پودے آپ سے بہتر ہو گئے ہیں۔ واپسی پر زیدی صاحب کلام صاحب کے پاس گئے اور کہا بھئی ذرا اپنے یوکلپٹس کے پودے تو دکھائیے میں نے بغیر دیکھے ذاکر صاحب سے تعریف کر دی ہے۔ کلام صاحب نے مسکرا کر کہا حضور وہ تو بوئے ہی نہیں دکھاؤں کہاں سے؟ وجہ یہ تھی کہ کلام صاحب کو معلوم نہیں تھا کہ اُن کو کیسے اور کس موسم میں بویا جائے اور ڈرتے تھے کہ اگر پودے ٹھیک نہ ہوئے تو ذاکر صاحب بازپرس کریں گے۔ ذاکر صاحب کی عادت تھی کہ وہ تفصیل سے ہر پودے کے بارے میں معلوم کرتے۔ وہ کام دے کر بھولتے نہیں تھے بلکہ مستقل نظر رکھتے تھے اور مشورہ دیتے رہتے تھے۔

راشٹرپتی بھون پہنچ کر حسب عادت سب سے پہلے توجہ مغل گارڈن کی طرف دی۔ ذاکر صاحب کے زمانہ میں مغل گارڈن میں گلاب کی اہم قسمیں اور ان کے چار ہزار عمدہ پودے تھے۔ گلاب کا پھول ذاکر صاحب کی جان تھا لیکن ان کو دوسرے پھول بھی پسند تھے۔ انہوں نے مغل گارڈن گرین ہاؤس میں ORCHIDS اور TULIPS لگوائے۔ ان کے ایرکنڈیشنڈ دارالمطالعہ میں ORCHIDS کا ایک گملا رکھا رہتا تھا۔ وہ اکثر افسوس کے ساتھ کہا کرتے تھے دہلی کی آب و ہوا ORCHIDS کے لئے مناسب نہیں۔ انہوں نے مغل گارڈن میں بوگن ویلیا، بیل والے پودے اور پھول دار درخت اس طرح لگوائے تھے کہ راشٹرپتی بھون میں سال بھر رنگ برنگے پھول کھلے رہتے تھے۔ ذاکر صاحب کے زمانہ میں راشٹرپتی بھون میں بوگن بیلی کی ۲۷ قسمیں تھیں ان سے پیشتر وہاں کیکٹس کو کوئی جگہ نہیں ملی تھی۔ ذاکر صاحب نے میکسیکو اور الجیریا جیسے دور دراز ملکوں سے کیکٹس کی نایاب قسمیں منگائیں۔

ذاکر صاحب حسن کے شیدائی تھے۔ پھول، پتھر، آرٹ، زندگی، ہر چیز میں اس کے متلاشی رہتے۔ بدنمائی اور بگاڑ کو ان کے دل نے کبھی قبول نہ کیا۔ وہ کہا کرتے تھے اگر کوئی کام اس لائق ہے کہ کیا جائے تو وہ اس لائق بھی ہے کہ سلیقے سے کیا جائے۔ حسن کا ایسا پرکھنے والا اس دنیا میں بہت کم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب — ایک یاد

انور معظم

گرم رَو بادِ فنا ہے از کراں تا بہ کراں
تو نے اس بادِ فنا میں بھی جلائے ہیں چراغ
تیری خوشبو سے مہکتی ہیں فضائیں درد کی
تیری مستی سے چھلکتے ہیں دلوں کے ایاغ

تیرے اشکوں سے لہکتی ہے ابھی کشتِ نجوم
تیری سانسوں سے مہکتا ہے گلابوں کا وطن
بے بسی کی سر سیہ دیوار پر شعلوں کا رقص
اک چراغِ عزم ہے یہ تیرے چہرے کی تھکن

تو نے بخشی ہے لبوں کو دولتِ تشنہ لبی
کاسۂ چشمِ تمنا کو دیئے ہیں تو نے خواب
سایۂ دیوار بن جاتے ہیں غم کی دھوپ میں
تیری آوازوں کے سائے تیرے خوابوں کے سحاب

پھول سے کھلتے چلے جاتے ہیں آنکھوں میں تمام
یاد کی دہلیز پر یہ کون رکھتا ہے قدم
اک حریفِ ساز و ساماں، اک قتیلِ جستجو
اک امینِ دردِ انساں، اک سراپا چشمِ نم

دل کے آنگن میں یہ کون آتا ہے شبنم کی طرح
آنسوؤں کی چاندنی خوابوں کی رعنائی لئے
اپنی آنکھوں میں بسائے شعلۂ فردا کی لو
اپنے ہاتھوں میں چراغِ شامِ تنہائی لئے

تیری یادوں سے دیارِ جاں یونہی روشن رہے
تیری خوشبو سے معطر رُوح کا دامن رہے

شخصیت جو عظیم تھی

محمد اخلاق قاسمی (بی ایڈ)

ذاکر صاحب کی شخصیت سے ہر ہندوستانی عموماً اور تعلیم یافتہ ہندوستانی خصوصاً واقف ہے وہ کسی تعارف کے محتاج نہیں ان کا نام لیتے ہی ذہن میں ایک عظیم شخصیت کا تصور ابھر آتا ہے وہ ان گنے چنے لوگوں میں سے ایک تھے جنہیں قدرت نے صورت و سیرت، دل و دماغ، شرافت اور دیانت، دوستی اور قیادت جیسی انمول اور گرانمایہ صفات سے نوازا تھا۔ وہ گلاب کے پھول یا شب ماہتاب کے مانند تھے جن کی فطرت میں ہی خوشبو دینا اور روشنی پھیلانا ہوتا ہے ان میں وہ صفات ودیعت کی گئی تھی جن کا جلوہ ہمیں کبھی کبھی خاصان خدا میں نظر آتا ہے

لیکن ان سب خوبیوں اور صلاحیتوں کے باوجود وہ اپنے لئے پیشہ تعلیم اختیار کرتے ہیں کیوں، جب کہ وہ جانتے تھے کہ اس پیشہ میں صبر اور ایثار کی ضرورت ہے۔ انسان دوستی اور جذبہ خدمت کی ضرورت ہے اور نفس کو مار کر محنت اور مشقت کرنے کی ضرورت ہے اس کی وجہ محض یہ تھی کہ انسانی خصوصیت، جس سے وہ عالم پر فائق و برتر ہے، علم محض یا عبادت محض نہیں بلکہ اس کی خصوصیت تعلیم و تلقین ہے، وہ جانتے تھے کہ جتنے بھی پیغمبران ہدایت اور مصلحین گذرے ہیں انہوں نے یہی تبلیغ اور معلمی کا پیشہ اختیار کیا ہے وہ جانتے تھے کہ انسان زمین پر خدا کا نائب بھی ہے اور قائم مقام بھی انہیں نائب خدا ہونے کی حیثیت سے ان ذمہ داریوں کا احساس بھی تھا اور ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش بھی کرتے تھے بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرنا وہ عین دین سمجھتے تھے وہ جانتے تھے کہ معلم کا خاموش اور سخت جان کام قوموں کے عروج و صعود میں کیا مقام رکھتا ہے انہیں اپنی قوم سے محبت بھی اس سے لگن بھی اس کی خدمت کو وہ اپنے لئے فخر اور اس کی ترقی کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے اقبال کے الفاظ میں وہ ایک مرد مومن تھے ان کی زندگی زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز سے لبریز بھی تھی اور معمور بھی۔

ڈاکٹر صاحب دین و دنیا دونوں کو ضروری سمجھتے تھے ان کے نزدیک دنیا کی حقیقت و ماہیت فلسفہ عملی پر مبنی ہے۔

چیست دنیا از خدا غافل بودن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

اسی لئے وہ اپنی قوم کے لئے وقت کی ضرورت کے مطابق ان تمام علوم و فنون کی تحصیل ضروری سمجھتے تھے جن کی مدد سے اس دنیا کو سنوارا جا سکتا ہے۔ اسے ترقی دی جاسکتی ہے ہاں وہ مذ دیا نتی، حق تلفی، حیانت اور فریب کو باعث ننگ و عار اور گناہ عظیم سمجھتے تھے ان کا عقیدہ تھا کہ اللہ نے انسان کو صرف عبادت کے لئے ہی پیدا نہیں کیا۔ عبادت کے لئے فرشتے ہی کیا کم تھے۔ آدم کی تخلیق تو اس اہم اور ضروری مقصد کی تکمیل کے لئے ہوئی ہے۔ کہ وہ اس دنیا کو بھی ترقی کی معراج تک لے جائے اور خدا سے اپنا رشتہ استوار رکھ کر آخرت کو بھی سنوارے۔ ایسی درمیانی راہ کو ڈاکٹر صاحب نے جامعہ میں اختیار کیا اور اس لئے انہوں نے جامعہ کو کسی سیاسی پارٹی سے وابستہ نہیں کیا کیونکہ پارٹی میں تحقیق اور انفرادیت کے بجائے اطاعت اور پیروی چاہتی ہے اسے حق سے زیادہ اطاعت کی تلاش ہوتی ہے اور ڈاکٹر صاحب طاقت کو حق کا غلام اور بندہ تصور کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے ہندوستانی مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ اپنی گذشتہ تاریخ کے پیش نظر ملک کی سماجی اور سیاسی خدمات میں پیش پیش رہ کر دنیا میں جہاں کہیں بھی ظلم و جہالت اور بے انصافی ہو اسے دور کرنا اپنا قومی اور ملی فریضہ سمجھیں مذموم فرقہ واریت یہی نہیں کہ ایک مذہب کے پیروکار دوسرے مذہب کے ماننے والوں کو برا سمجھیں ان کا برا چاہیں اور ان کے مٹانے کی کوشش کریں۔ بلکہ فرقہ واریت کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ ایک علاقے کے لوگ دوسرے علاقے کے لوگوں کا استحصال کریں یا ایک پیشہ کے افراد دوسرے پیشہ والوں پر اپنی برتری جتائیں یہ اور اس طرح کی مصنوعی تفریقیں وحدت انسانی کو پارہ پارہ کر دیتی ہیں وہ سب کی سب لائق نفرت فرقہ پرستی ہی کی قسمیں ہیں اور ان سب کا مٹانا انسان کا اولین فریضہ ہے کیونکہ یہ وہ متعدی بیماری ہے جو انسانی برادری میں طرح طرح کی برائیوں کو جنم دیتی ہے اس کی ترقی کی راہ میں روڑے اٹکاتی ہے اس کی تہذیب کو مٹنے اور سنورنے کا موقع نہیں دیتی اور ہمیشہ اسے تباہی و بربادی کی طرف لے جاتی ہے۔ اس لئے انہوں نے جامعہ کی تعلیم کا اولیں مقصد ہی نوع انسان کی خدمت قرار دیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک رواداری اور انصاف کی تلقین اچھی تعلیم کا سب سے اہم مقصد ہے اقبال نے اسی بات کو اس طرح بیان کیا ہے ؎

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

ذاکر صاحب جرمنی سے واپسی پر اپنے مشن کی تکمیل میں مصروف ہو گئے اور انہوں نے جامعہ ملیہ کی سوکھتی ہوئی بیل کی آبیاری شروع کر دی۔ ۱۹۲۷ء میں حکیم اجمل خاں کے انتقال کے بعد جامعہ چلاتے رہنا قریب قریب ناممکن ہو گیا تھا کیونکہ وسائل کے فقدان اپنوں کی مخالفت اور غیروں کی شماتت کے ہوتے ہوئے جامعہ کا چلانا ہر ایک کا کام نہیں تھا یہ کام صرف وہی شخص کر سکتا تھا جسے خدا پر خود پر اور انسان پر پکا اعتماد ہو ڈاکٹر ذاکر حسین میں یہ تمام صفات بھرپور موجود تھیں انہوں نے جامعہ کے سفینے کو غرق ہونے سے ہی نہیں بچایا بلکہ اسے اس ساحل پر لگایا جسے دیکھ کر مسلم قوم کا سر فخر سے اونچا ہے

۱۹۴۷ء کے بعد ملک آزاد ہوا اور دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اس تقسیم سے جہاں بہت سے نئے مسئلے پیدا ہوئے وہیں بہت سے پرانے مسئلے اور پیچیدہ ہو گئے ان مسائل میں ایک مسئلہ مسلم یونیورسٹی کا تھا تقسیم ملک کے بعد مسلم یونیورسٹی کا مستقبل تاریک تھا لیکن حکومت وقت نہیں چاہتی تھی کہ اس ادارے کے مستقبل کو کسی طرح کا گزند یا نقصان پہنچے اس لئے اسے ایسے شخص کی تلاش تھی جو آڑے وقت میں اس ادارے کی باگ ڈور سنبھالے ذاکر صاحب تعمیر جامعہ میں اپنی بھرپور صلاحیتوں کا مظاہرہ کر چکے تھے لہٰذا حکام وقت کی نظر انتخاب نے انہیں چن لیا اور مسلم یونیورسٹی کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں دے دی گئی۔ ذاکر صاحب نے یونیورسٹی کی بھرپور خدمت کی اور جہاں تک ان سے بن پڑا ناامیدی میں امید، بے دلی میں ولولہ، بدنظمی میں نظم اور تاریکی میں نور پیدا کر کے انہوں نے طلباء اور اساتذہ میں وہی جوش اور امنگ پیدا کر دی جو ۱۹۴۷ء سے پہلے تھی اور مجاز کے ترانہ کی صدائے بازگشت پھر یونیورسٹی کی فضاؤں میں گونجنے لگی اور ناہید و پروین سے منقطع رشتے پھر استوار ہو گئے۔

اس فرش سے ہم نے اڑ اڑ کر افلاک کے تارے توڑے ہیں
ناہید سے کی ہے سرگوشی پروین سے رشتے جوڑے ہیں
جو ابر یہاں سے اٹھے گا وہ سارے جہاں پر برسے گا
خود میرے جہاں پر برسے گا غیروں کے جہاں پر برسے گا

ان رشتوں کو استوار کرانے والے تھے ذاکر صاحب جنہوں نے اس چیلنج کو قبول کیا تھا جس کے قبول کرنے سے اس وقت کے تمام ممتاز ماہر تعلیم لوگوں نے انکار کر دیا تھا۔

ذاکر صاحب میں خلوص، ذاتی کشش اور فہم و فراست تھی یہ تینوں غیر معمولی باتیں جب انسان میں جمع

ہوجاتی ہیں تو وہ جس کام کو ہاتھ میں لیتا ہے اسے بحُسن وخوبی انجام دیتا ہے انہوں نے اپنی ان صفات کی مدد سے اپنے گورنری کے عہدے کے فرائض کو بخوبی انجام دیا اور ساتھ میں لوگوں کے دلوں کو بھی موہ لیا وہ سعدی کے اس قول کے قائل بھی تھے اور عامل بھی

دل بدست آور کہ حج اکبر است

صد ہزاران کعبہ یک دل بہتر است

۱۹۶۲ء میں وہ ہند کے نائب صدر اور راجیہ سبھا کے چیرمین مقرر کئے گئے یہ کام ان کے گذشتہ کاموں سے مختلف بھی تھا اور متضاد بھی یہ ایک ایسا آرائشی عہدہ ہوتا ہے کہ جس میں صدر کی عدم موجودگی میں کرسی صدارت پر بھی جلوہ افروز ہونا پڑتا ہے راجیہ سبھا کی صدارت بہت مشکل اور تھکا دینے والا امر ہے۔ راجیہ سبھا کی مثال ہمیشہ موجیں مارتے ہوئے سمندر کی سی ہوتی ہے یہاں ہر وقت حملے ہوتے ہیں، پھر جوابی حملے ہوتے ہیں طرح طرح کی رسہ کشی ہوتی ہے یہاں ہر وقت صدر کی ذہانت وفراست کا امتحان لیا جاتا ہے اور اس کی قوت عدل کی آزمائش ہوتی ہے ذاکر صاحب اپنے اس امتحان میں بھی فائز المرام رہے شاید ذاکر صاحب نے اپنے اس عمل میں ہادی اعظم کی مثال بطور نمونہ رکھی تھی جو انہوں نے حجر اسود نصب کرتے وقت دو مخالف گروہوں میں تصفیہ کرا کر خراج تحسین حاصل کیا تھا لہذا جب ذاکر صاحب راجیہ سبھا کی صدارت سے سبکدوش ہوئے تو ان کی خدمات کا تمام پارٹیوں نے اعتراف کیا اور انہیں خراج عقیدت پیش کیا

اس کے بعد وہ ملک کی صدارت عظمیٰ کے لئے منتخب کئے گئے یہ انتخاب اگر ایک طرف ان کے ممتاز اور ہر دل عزیز ہونے کا اعتراف تھا تو دوسری طرف اس بات کا اعلان بھی تھا کہ ان میں قوم کی نمائندگی کرنے کی خصوصیت موجود ہے۔

آں نہ من باشم کہ روز جنگ بینی پشت من

آں منم کاندر میاں خاک وخوں بینی سرے

الغرض ذاکر صاحب اپنی مثال آپ تھے ایسے جامع صفات اشخاص خال خال ہی نظر آتے ہیں وہ مقرر بھی تھے اور مصنف بھی ماہر تعلیم بھی اور ماہر اقتصادیات بھی شفیق دوست بھی اور عظیم قائد بھی وہ میر کارواں کی نگہ بلند، سخن دل نواز اور جان پُرسوز کے حاصل بھی تھے افسوس کہ انہوں نے ایسے وقت انتقال کیا جبکہ ملک، قوم اور جامعہ کو ان کی اشد ضرورت تھی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین ——— ایک ادیب

عبدالغفار رشید (بی۔ایڈ)

ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت منفرد اور جامع صفات تھی۔ وہ نہ صرف ایک بلند پایہ مفکر اور ایک بیدار مغز سیاست داں ہی تھے بلکہ ایک جادو بیاں مقرر اور ایک صاحب اسلوب انشاپرداز بھی تھے۔ قدرت نے انہیں تصنیف و تالیف کی بہترین صلاحیتیں عطا کی تھیں۔ مگر قومی فرائض کی ادائیگی نے انہیں وہ فرصت نہ دی جو تالیف و تصنیف کے لئے بہت ضروری ہے۔ جامعہ کی معلمی کے بعد علی گڑھ کی قیادت بہار کی گورنری، راجیہ سبھا کی چیرمینی اور پھر جمہوریۂ ہند کی صدارت جیسے عظیم منصوبوں پر فائز رہے اور انہیں فرض سمجھ کر انجام دیتے رہے لیکن ان تمام مصروفیات کے باوجود جب بھی انہیں موقع ملا ہمارے علم و ادب میں بیش بہا اضافے کئے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین ایک صاحب طرز ادیب تھے لیکن پیشہ ور نہیں تھے۔ انہوں نے جو کچھ لکھا وہ ضرورتاً ہی لکھا ہے لیکن ان کی ایک ایک سطر میں ان کا مخصوص اور منفرد طرز نگارش ہے جو عجیب جادو جگاتا ہے۔ اور ان کی اس خصوصیت کو بڑے بڑے پیشہ ور ادیب اور نقاد بھی نہیں پہنچ سکے جنہوں نے ادب ہی کے لئے عمریں گنوائی ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں اپنی شخصیت کا رچاؤ سمو دیا ہے ان کی نثر سادہ مگر اتنی ہی دل آویز اور تخلیقی جوہر سے مالا مال بھی ہوتی ہے ان کی تحریروں میں ہیرے کی طرح ترشتے ہوئے خیالات، گہری بصیرت، حکیمانہ نظر اور حسن کاری کا گہرا نقشہ ہوتا ہے بقول آل احمد سرورؔ "ڈاکٹر ذاکر حسین کے یہاں ایک مفکر کی تابانی فکر، ایک معلم کی شفقت و مرحمت، ایک عاشق کا سوز و گداز، ایک مدبر کا وزن و وقار، ایک صوفی کی درویشانہ شان اور ایک مہاتما کی سی معصومیت، سب کا جلوہ نظر آتا ہے ——— ان کے یہاں علم صرف معلومات کا خزانہ ہی نہیں انسانیت کے اعلیٰ اقدار کی خدمت کا وسیلہ بھی ہے"

اس میں شک نہیں کہ ایک طرف گاندھی جی کی حق بینی حق شناسی، حق کوشی اور ہمہ گیر انسانیت

کی آنچ سے اگر کچھ سونے کو کندن بنایا تو دوسری طرف حکیم اجمل خاں کے خلق و مروت، صبر و علم نے اس پر جلا دی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنی بے نظیر صلاحیتوں سے بہت سے کام لئے۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی ہے۔ بہت سی انگریزی کتابوں کے تراجم کئے، خطبات لکھے اس کے علاوہ بچوں کے لئے کہانیاں اور ڈرامے لکھے جو بہت مقبول ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کا اصلی کارنامہ جس نے ان کی ادبی زندگی کو زندہ جاوید بنا دیا ہے وہ افلاطون کی شہرۂ آفاق تصنیف "ریاست" یا "تحقیق عدل" کا اردو ترجمہ ہے اس ترجمہ کی بڑی اور بنیادی خوبی یہ ہے کہ یہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ ذاکر حسین کی ذہنی اپج معلوم ہوتا ہے۔ یہ ترجمہ نہایت سلیس، شستہ اور رواں زبان میں کیا ہے اس پر مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں افلاطون کے تمام پہلوؤں سے اردو دنیا کو روشناس کرا دیا ہے مقدمہ میں ان کی زبان اس قدر پُر مغز، جاندار اور شگفتہ ہے کہ پڑھنے والا لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اس میں افلاطون کے نظریات کو بھی پیش کیا گیا ہے افلاطون کے نزدیک انسان محض انفرادی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اپنی صلاحیتوں کو کمال کے درجہ تک پہنچانے کے لئے کسی جماعت، کسی ریاست کی ترکیب کا محتاج ہوتا ہے اچھا آدمی اچھی ریاست میں ہی پیدا ہو سکتا ہے اس سے ذاکر حسین کی طبیعت کے مخصوص رنگ کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ علم کو ہنرمندی کا ذریعہ نہیں سمجھتے بلکہ انسانیت کی خدمت کا ایک وسیلہ قرار دیتے ہیں۔ مقدمہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین افلاطون کے بعض بنیادی خیالات سے متفق نظر آتے ہیں۔ وہ افلاطون کے اس خیال کی بھی تائید کرتے ہیں کہ تعلیم درحقیقت ریاست کا کام ہے۔ بہرحال اس کتاب سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ افلاطون کوئی بات نہیں کہہ رہا بلکہ ذاکر صاحب خود بول رہے ہیں اس کتاب کی زبان اور انداز بیان اتنا دلکش ہے کہ اردو میں ایسی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کا خاص مضمون جس میں انہوں نے برلن یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی معاشیات ہے انہوں نے اردو میں معاشیات کے مسائل کو علمی مگر شگفتہ انداز میں بیان کیا ہے۔ "معاشیات ـــــــ مقصد اور منہاج" ویسے تو یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے مگر اس میں معیاری، ترتیبی اور اجتماعی معاشیات کے تمام بنیادی اصول نہایت دلکش اور دلنشیں اسلوب میں بیان کر دیئے گئے ہیں انہوں نے ادبی دنیا پر یہ بات واضح کر دی کہ نہایت پیچیدہ اور دقیق علمی مسائل کو سلیس اور سادہ زبان میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ انہوں نے معاشیات پر بہت سے مغربی مفکروں کے خیالات کا ترجمہ بھی کیا ہے مگر اس کتاب کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کو تحریر و تقریر پر حیرت انگیز قدرت حاصل تھی جس کا ثبوت ان کے وہ "تعلیمی خطبات" ہیں جو انہوں نے مختلف اوقات میں لکھے تھے اور جو ان کی مستقل تصانیف پر بھی بھاری ہیں ان خطبات کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس میں زبان کی روانی اور بیان کی قدرت موجود ہے اور بقول پروفیسر مجیب "قدرتی استعداد نے زبان کو اپنا خادم بنا کر اس میں وہ خوبیاں پیدا کر دی ہیں جو ادیبوں کی تحریروں کو برسوں کی مشق اور محنت کے بعد نصیب ہوتی ہیں" حقیقت یہ ہے کہ ذاکر صاحب نے جب بھی کچھ لکھا ہے تو اس میں اپنے خلوص، دل سوزی اور سماجی شعور کی وجہ سے الفاظ میں ایسی موتی سی کلیاں بھر دی ہیں جن کی وجہ سے الفاظ میں آب و تاب پیدا ہو گئی ہے۔ اور جس سے انسانوں کی زندگی بدلتی، سنورتی اور نکھرتی ہے۔ ان خطبات کی دوسری خوبی یہ ہے کہ ان کا انداز تقریر کا ہے تحریر کا نہیں اور کہیں کہیں خطابت بھی ابھار رہی دکھائی دیتی ہے ان خطبات میں ذاکر حسین نے تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر جس طرح اظہار خیال کیا ہے اس سے ان کے سماجی شعور، بالغ نظری، نفسیاتی ژرف بینی اور حب الوطنی کا حیرت انگیز ثبوت ملتا ہے مجموعی طور پر ذاکر صاحب کا مقصد ہمیں سچی تعلیم سے روشناس کرانا اور علم کی روشنی سے مالا مال کرنا تھا ڈاکٹر ذاکر حسین نے ایسے ایک خطبے میں اچھے استاد کا جو نصب العین پیش کیا ہے۔ اس میں ان کے خیالات کی اہمیت کے ساتھ ساتھ ان کے طرزِ نگارش کی دل کشی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

"استاد کی کتابِ زندگی کے سرورق پر علم نہیں لکھا ہوتا، محبت کا عنوان ہوتا ہے۔ اسے انسانوں سے محبت ہوتی ہے، سماج سے محبت ہوتی ہے۔ اچھے استاد کی جذباتی زندگی میں وسعت بھی ہوتی ہے اور گہرائی بھی اور پائیداری بھی اس کی روح میں حق و صداقت حسن و جمال، نیکی اور تقدس، انصاف اور آزادی کے مظاہر کی گرمی ہوتی ہے، جس سے وہ دوسرے دلوں کو گرماتا ہے اور جس میں تپا تپا کر اپنے شاگردوں کی سیرت کو نکھارتا ہے، اچھے استاد میں اہل قوت اور حکمرانوں کی سیرت کا ایک ذرہ بھی نہیں ہوتا اس میں اور ان میں زمین آسمان کا فرق ہے، حکمران جبر کرتے ہیں اور یہ صبر کرتا ہے، وہ مجبور کر کے ایک راہ پر چلاتے ہیں اور یہ آزاد چھوڑ کر ساتھ لیتا ہے، ایک کے وسائل ہیں تشدد اور زبردستی، دوسرے کے محبت اور خدمت، ایک کا کہا ڈر سے مانا جاتا ہے، دوسرے کا شوق سے، ایک حکم دیتا ہے، دوسرا مشورہ، وہ غلام بناتا ہے، یہ ساتھی، جب ساری دنیا مایوس ہو جاتی ہے تو بس دو آدمی ہیں جن کے سینے میں امید باقی رہتی ہے، ایک اس کی ماں دوسرا اچھا استاد۔"

مندرجہ بالا اقتباس میں ذاکر حسین کے طرز تحریر کی سادگی اور روانی ایک نکتہ سنجی، نکتہ آفرینی اور خلوص کے ساتھ موجود ہے جا بجا دلکش ترکیبیں اور دل میں اُتر جانے والے مُرصّع فقروں میں جذبات کا طوفاں موجزن ہے۔ فکر انگیز خیالات میں ان کی شخصیت ایک پوری توانائی کے ساتھ موجود ہے صداقت اور بے باکی نے ان کی تحریر کو پُر تاثیر بنا دیا ہے ان کی خطابت اور اثر آفرینی کی بہترین مثال وہ خطبہ ہے جس میں انہوں نے بنارس کے فارغ التحصیل طالب علموں کو خطاب کیا تھا۔

"تم جس دیس میں یہاں سے نکل کر جا رہے ہو، وہ بڑا بدنصیب ملک ہے وہ غلاموں کا ملک ہے، بے رحموں کا ملک ہے، ظالمانہ رسموں کا ملک ہے، عافل پجاریوں کا ملک ہے، بھائی بھائی میں نفرت کا ملک؛ بیماریوں کا ملک ہے سستی کا ملک ہے، افلاس اور ناداری کا ملک ہے، بھوک اور مصیبت کا ملک ہے، غرض بڑا کم بخت ملک ہے۔ لیکن کیا کیجئے ہمارا اور ہمارا ملک ہے۔ اسی میں جینا ہے اور اسی میں مرنا ہے۔ اس لئے یہ ملک تمہاری ہمتوں کے امتحان تمہاری قوتوں کے استعمال اور تمہاری محنت کی آزمائش کی جگہ ہے ممکن ہے کہ آپ کے جی میں آئے جاؤ اور اتنی تباہی، اتنی مصیبت اتنا ظلم دیکھ کر بے صبری میں یہ چاہو کہ اس میں بسنے والی سماج ہی کو ختم کر دو اور برباد کر ڈالو، اس لئے کہ اس میں سدھار کی کوئی صورت نہیں۔ تمہیں اختیار ہے مگر آپ بھائی کی رائے سن لینے میں کیا نقصان ہے ـــــــــ قومی زندگی کا کون سا شعبہ ہے جس میں پہلے سے تباہی کا دور دورہ نہیں ہے؟ ـــــــــ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں بگاڑنا اتنا نہیں ہے جتنا کہ بنانا ہے ہمارے دیس کو ہماری گردنوں کے خون کے دھارے کی ضرورت نہیں ہے ـــــــــ ضرورت ہے کام کی، خاموش اور سچے کام کی ـــــــــ اس میں تھکن بھی زیادہ ہے اور قدر بھی کم ہوتی ہے، جلدی نتیجہ بھی نہیں نکلتا، ہاں کوئی دیر تک صبر کر سکے تو ضرور پھل میٹھا ملتا ہے۔"

مندرجہ بالا اقتباس میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے انداز بیاں میں خطیبانہ شان موجود ہے لیکن اس میں آورد اور تصنع کا نام نہیں ہے بلکہ فکر میں سموئی ہوئی سچی جذباتی کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔ ان کی تحریر دل میں خلوص کے ساتھ جوش اور ولولہ تازگی اور قوت ہے جو ان کی شخصیت کا عطیہ ہے وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں فطری انداز میں کہہ دیتے اور خوبی یہ ہے کہ مضمون کی نوعیت کے مطابق ہی ایسا طرز بیاں اختیار کرتے ہیں۔ اور ویسے ہی الفاظ لاتے ہیں جو ان کی تحریر و تقریر میں یکساں زور اور تاثیر پیدا کر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے ایک مفکر اور معلم کی حیثیت سے بچوں کی تعلیم کو خصوصی توجہ کا مستحق سمجھا کیونکہ اس سے پہلے بچوں کے ادب کی طرف توجہ نہیں دی گئی تھی لہذا انہوں نے خود بچوں کی تعلیم اور ان کے مسائل سے متعلق بہت سی کہانیاں لکھیں، ان کہانیوں کی زبان بچوں کی ہے اور موضوعات بھی بچوں کی پسند کے لیکن

بات اتنی گہری کہہ جاتے ہیں کہ بڑے بھی ان کو پڑھ کر سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جب ذاکر حسین نے کہانیاں لکھنا شروع کیں اس وقت آزادی کی جدوجہد زوروں پر تھی لہذا ان کی کہانیوں میں بھی اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے "ابو خاں کی بکری" آزادی کی سچی لگن پیدا کرتی ہے اور اس سے قربانی کا درس ملتا ہے۔ اسی طرح "عقاب" بھی جذبۂ آزادی کو ابھارتی ہے۔ اور غلامی کی زنجیروں کو توڑنے پر آمادہ کرتی ہے۔ "آؤ گھر گھر کھیلیں" میں قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کی جھلک دکھائی دیتی ہے "ماں" "چھدا" "چوری" "جو کٹھاؤں سے نکل بھاگی" "مرغی جو اجمیر چلی" "کچھوا اور خرگوش" وغیرہ ایسی کہانیاں ہیں جس میں کوئی نہ کوئی اخلاقی درس دیا گیا ہے۔ ان ظاہری محاسن کے ساتھ ساتھ ان میں معنوی خوبیاں بھی ہیں کہانیوں کی زبان سلیس اور سادہ ہے قدرتی طرزِ بیان ہے جیسے کسی سے باتیں ہو رہی ہوں بچوں کی نفسیات کو دیکھتے ہوئے طرزِ بیان موزوں ہے۔ یہ کہانیاں اتنی دل چسپ ہیں کہ جوان اور بوڑھے سبھی شوق سے پڑھتے ہیں۔ یہ کہانیاں ان کے تخیل کی اپج، قوت مشاہدہ اور نفسیاتی مطالعے کی حسن کاری کا ایک بین ثبوت ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنی مصروفیت کے باوجود جو کچھ بھی لکھ دیا ہے وہ ہمارے علم و ادب میں قیمتی اور مستقل اضافے کی حیثیت رکھتا ہے انہوں نے ہماری ذہنی، سیاسی، تہذیبی، تعلیمی اور ادبی زندگی کے کے ہر موڑ پر اپنے قلم سے جادو جگائے ہیں جس میں ان کا شریفانہ اور نازک احساس، شگفتہ ادبی ذوق، بیدار اور تربیت یافتہ شعور، وسیع و متنوع مشاہدہ، علم اور تجربہ، انسانیت سے عشق اور خدائے واحد پر ایمان ان کی تحریر و تقریر کو غیر معمولی کشش، قوت، حسن اور تاثیر بخشتے ہیں۔

"اچھا استاد اپنے بہت سے کام بچوں ہی کی طرح قدرتی طور پر زیادہ سوچے بغیر ہی کر گزرتا ہے"

(ڈاکٹر ذاکر حسین)

ڈاکٹر ذاکر حسین ——— ایک انسان دوست

ع۔ سعیدہ یاسین (دلّا پیڈ)

ذاکر صاحب مشرقی تہذیب اور علوم و فنون کے ماحول میں پروان چڑھے
تھے۔ ان کی ذات نے اگر ایک طرف مذہبی قدروں کو اپنے اندر جذب کیا تو دوسری طرف اُن کی خلاق طبیعت نے مغربی قدروں کو بھی اپنایا۔ ان کی ذات گنگ وجمن کے اس سرسبز دستاویز ہندوستان میں مشرق و مغرب کا ایک سنگم تھی۔ ان کی ذات میں اگر مشرق کی سکون پذیری اور گہرائی، رواداری، وضعداری کا، انسانیت اور روحانی بصیرت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی تو مغرب کی روشن خیالی، ذہنی جرات انسان دوستی اور عملیت کا جذبہ بھی کارفرما تھا۔ ان کی ذات ماضی و حال کے درمیان مشرق و مغرب کے درمیان ایک پل کا کام کرتی تھی۔

ذاکر صاحب کی زندگی کا مقصد " ما بر نعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست " نہیں تھا۔ ان کی زندگی وقف تھی حق کی بلندی، امن و آشتی کی ترویج اور باطل کے ہر طوفان سے ٹکرانے کے لئے۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اُن کا وجود آیت فی الارض خلیفہ کی توضیح بھی تھا اور تشریح بھی۔ ان کی حق پرستی اور صداقت شعاری سے بہت سے بے قراروں کو قرار، مظلوموں کو ظلم و ستم سے نجات اور کمزور و ناتوانوں کو توانائی اور طاقت ملی۔ سچ پوچھئے تو ان کی ذات اقبال کے اس شعر کی سچی تفسیر تھی۔

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کا دل جس سے دہل جائے وہ طوفان

ان کے عزم مسلسل سعی پیہم اور ارادوں کی پختگی نے بزدلی اور احساس کمتری کے شکنجوں میں جکڑے ہوئے انسانوں کو ناامیدی، حرماں نصیبی اور مایوسی کے قعر مذلت سے نکال کر امید اور ولولہ، نور اور روشنی عطا کی۔ گلستان جامعہ و علی گڑھ اپنی زیب و زینت کے لئے انہیں کے خون جگر کے محتاج تھے۔ انہوں نے

جامعہ کی باگ ڈور اس وقت سنبھالی جس وقت باد سموم کے تند و تیز جھونکے اس گلشن کو تہ و بالا کر رہے تھے اور قومی رہنماؤں میں سے کوئی بھی اس کی زمام سنبھالنے کو تیار نہیں تھا لیکن ڈاکٹر صاحب، جن کی ذات کے کچے سونے کو گاندھی جی کی حق کوشی و حق بینی نے کندن بنا دیا تھا اور تحمل حال کے صبر و حلم نے اسے جلا دی تھی، اس چمن کی آبیاری میں مصروف ہو گئے۔

بے گانہ ہوئی دنیا رسم و رہ الفت سے
اک میری طبیعت ہے جو باز نہیں آتی

اسی طرح آزادی کے بعد جب علی گڑھ کی عطر بیز فضا مکدر ہو گئی اور اس کی شام مصر دشت تیرہ تار بھیگی پڑ گئی اور طاق حرم کی شمع فروزاں گل ہونے لگی تو اس وقت بھی ڈاکٹر صاحب کی خدمات وہاں کی فضا کو خوشبو سے بسانے کے لئے حاصل کی گئیں۔

ڈاکٹر صاحب قدرت کے عظیم احسانات سے مالا مال ہونے کے باوجود کبر و نخوت اور سرکشی جیسی لائق نفرت چیزوں سے ہمیشہ دور رہے۔ ان کی روح مظلوموں کی بے بسی دیکھ کر تڑپ اٹھتی تھی، یتیموں کے آنسو دیکھ کر ان کی آنکھیں نمناک ہو جاتی تھیں۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ اور ہر آن انسانوں کی پریشان زندگیوں کو آسودگی سے سرشار کرنے کے لئے وقف تھا۔ عزت و شہرت، جاہ و حشمت اور دولت کی حصول یابی کے لئے نہیں بلکہ ظلم و ستم جور و جفا اور استبدادی قوتوں کو پامال کرنے کے لئے امن و اماں، عدل و انصاف، صداقت و راست بازی کے قیام عام کے لئے وہ قرون ثلاثہ کے ایک زندہ اور تابندہ روشن ستارہ تھے جس کے لئے اقبال نے یہ شعر کہا ہے۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

وہ جس انجمن، گلستان اور چمن پر اپنے پاکیزہ قدم رکھتے شکستہ قلوب اور پرسوز نالے انہیں کی چارہ سازی کے منتظر رہتے، مغموم و رنجور، درماندہ و شکستہ حال، محتاج و پریشان حال، دل گیر و دل فگار ستم رسیدہ اور زندگی سے بیزار ہستیاں، ان کی آمد پر درازی عمر کی دعائیں کریں۔ ان کی آمد سے وحشت اور ویرانیاں ختم ہو جائیں خوشیوں اور مسرتوں کے چمن شاداب ہو جاتے، علمی فضائیں قائم ہو جاتیں، عدالت الہیہ کا سماں بندھ جاتا، امن و اماں، صداقت و راست بازی اور ایمان و یقین کا نور، ظلم و ستم، جور و جفا شر و فساد اور تمام طاغوتی طاقتوں پر غالب آجاتا۔ فی الحقیقت وہ اس امت کے ایک فرد تھے جس امت کے لئے اقبال نے بزبان ابلیس یہ کہا ہے:۔



ہر نفس ڈرتا ہوں اس اُمت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے کی احتساب کائنات

ذاکر صاحب علم دوست بھی تھے اور علم نواز بھی علم اُن کے لئے "بار بایۂ بر دو کتابے چند" کے مصداق نہیں تھا ان کا علم ان کے لئے روشنی تھا، نار نہیں، وہ اُن کے لئے شمع ہدایت تھا معتمہ نہیں آج ہندمیں کون واقف نہیں کہ اس عالم مفکر، مدبر اور ماہر تعلیم نے کلمۂ حق کہنے سے کبھی روگردانی نہیں کی۔ اس علم کی ہی بدولت وہ اپنے مقصد کے حصول میں برابر کوشاں رہے اور دائرہ الزام بھی ہونے میں تو اقبال کے جب یہ اشعار پڑھتی ہوں تو سچ مچ ذاکر صاحب کی زندگی کو ان اشعار کی جیتی جاگتی تصویر پاتی ہوں ۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم ؛ سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی ؛ خیابان و گلزار و باغ آفریدم

اس کا ماحصل یہ ہے کہ اے خدا تو نے رات پیدا کی جو تاریک اور اندھیری ہے اور میں نے تاریکی کو دور کرنے کے لئے چراغ ایجاد کیا۔ تو نے مٹی کا پیالہ بنایا تھا میں نے شیشے کا بڑا پیالہ بنایا تو نے بیابان، پہاڑ اور چراگاہیں پیدا کیں" جو ویران اور غیر آباد تھیں، میں نے ان کو آباد کر کے پھولوں کی کیاریاں گلزار اور باغ بنائے ڈاکٹر صاحب کی پوری زندگی ان اشعار کی ترجمان ہے وہ جہاں بھی گئے اپنے پیچھے ایک لہلہاتا باغ اور چمن چھوڑ آئے ہیں۔ وہ انسان آج صفحۂ ہستی پر نہیں لیکن اس کے آدرش، اصول اور وہ مثالیں باقی ہیں جس کے لئے وہ زندہ تھے، ہم ان کی مثالوں کو زندہ رکھ کر، انہیں عملی جامہ پہنا کر انہیں آنے والی نسلوں تک پہنچا کر اگر ایک طرف ان کے احسان کے بارگراں سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں تو دوسری طرف اُن کی روح کو تسکین بھی دے سکتے ہیں اُن کی مثالیں گرمی بھی دیں گی اور روشنی بھی حرارت بھی دیں گی اور حرکت بھی۔ اُن کی مثالوں کے ذریعہ ہم ہمیشہ ان کو اپنے درمیان پائیں گے اس بات کو حافظ شیرازی بھی تو کہہ گئے ہیں

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

ذاکر صاحب کی زندگی کا ہر پہلو اور رُخ ہندوستانیوں کے لئے ایک مثال ہے۔ ایک نمونہ ہے اور مشعل راہ بھی ہے کیونکہ وہ اگر ایک طرف پکے اور سچے مسلمان تھے تو دوسری طرف پکے اور سچے ہندوستانی بھی تھے انہوں نے اپنے کردار اور عمل سے یہ ثابت کر دکھایا کہ بیک وقت ایک اچھا مسلمان اور اچھا ہندوستانی ہونا نہ صرف ممکن ہے بلکہ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کی لازم ملزوم ہیں۔

فی الحقیقت ایک اچھے مسلمان میں وہ تمام چیزیں ضرور ہوتی ہیں جو ایک اچھے شہری کے لئے درکار ہے یہی ہے کہ جب بھی کبھی وہ خطاب کرتے ان کے مخاطب خواہ وہ مسلمان ہوں یا کانسٹی ٹیوٹ یا پیپٹ کے طلبا اور اساتذہ بقول اقبال وہ۔

وہ کہتا ہے وہی بات سمجھتا ہے جسے حق
وہ اہلِ مسجد ہے نہ تہذیب کا فرزند

حق بات کہنے سے نہ چوکتے اُن کی حق پرستی، حق نواری، صداقت پرستی اور انسانیت دوستی کی تصویریں تو نہیں کھینچ سکتی ہاں اتنا کہہ سکتی ہوں کہ شاید اقبال نے ایسا یہ شعر ڈاکٹر صاحب جیسے لوگوں کے لئے کہا تھا۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

الغرض ڈاکٹر صاحب ان چند خوش قسمت انسانوں میں سے ایک تھے جو ہمارے قومی آسمان پر خورشید منور کی طرح چمکے اور جنہیں قدرت نے پورے طور پر وہ تمام چیزیں اور ان کی نقش جس کی آرزو ہر انسان کو ہوا کرتی ہے لیکن ان سب میں اُن کی ایک صفت بہت نمایاں تھی کہ وہ انسان دوست اور انسانیت نواز تھے وہ ان کے دکھ درد کو دیکھ کر تڑپ اُٹھتے تھے۔

تعلیمی کام ایک دھیمے دھیمے بہنے والا میدانی دریا ہے جو برسات ہی میں نہیں بہتا گرمی میں پہاڑوں کے برف جیسے دل کو پگھلا کر اپنی روانی کا سامان پیدا کرتا ہے۔"

(ڈاکٹر ذاکر حسین)

مردِ درویش

پروفیسر آل احمد سرور

زمانہ جس کی تلاش میں تھا یہی ہے ہمدم وہ مردِ دانا
نگاہ جس کی ہے عارفانہ، مزاج جس کا قلندرانہ
وہ جس کا دستور حق پسندی، وہ جس کا آئین دردمندی
وہ جس کے ایثارِ بے کراں کا ہے معترف آج تک زمانہ
جلال بھی ہے جمال بھی ہے یہ شخصیت کا کمال کہیے
خیال میں بجلیاں، گہر افشاں لبوں پہ اک دل رُبا ترانہ
وہ جس کی چشمِ ستارہ بیں نے فلک بھی دیکھا جہاں بھی دیکھے
پسند جس کو ہے دے کے آیا مگر کچھ اپنا ہی آشیانہ
اُفق پہ ہے روشنی سی لیکن وہ چشمِ بینا کہاں سے لائیں
ابھی حسینوں سے جن کی چھوٹا نہیں فرنگی کا آستانہ
ورق ورق ہے مرا صحیفہ ملے تو کیوں کر، کرے تو کیوں کر
اُدھر ہی آرزو کی گرمی، اِدھر خمارِ مئے شبانہ
ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

ڈاکٹر ذاکر حسین ـــــ ایک ہمہ گیر شخصیت

نواب الدین انصاری (بی ایڈ)

(۱) ایک انگریز مصنف کا قول ہے کہ بعض لوگ پیدائشی بڑے ہوتے ہیں بعض اپنی کوشش سے بڑائی حاصل کرتے ہیں اور بعض پر بڑائی زبردستی عائد کر دی جاتی ہے۔ دنیا میں اکثریت تیسرے قسم کے بڑے لوگوں کی ہے پہلی قسم کے لوگ جن کی پیشانی پر بچپن ہی سے بلندی کا ستارہ روشن ہوتا ہے شاذ و نادر ہی پیدا ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کا شمار پہلی قسم کے لوگوں میں ہوتا ہے۔ اور انہیں دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ قدرت کے سامنے "انسان" کا کس قدر بلند تصور ہے آج ذاکر صاحب ہمارے درمیان میں نہیں لیکن ان کی ہمہ گیر اور عہد آفریں شخصیت کے نقوش جگمگا رہے ہیں یہ نقوش کبھی دھندلے نہ ہوں گے۔ اور آنے والی نسلیں ان سے روشنی حاصل کریں گی۔

(۲) ذاکر صاحب کی گوناگوں شخصیت کو سمجھنے اور جاننے کے لئے ان کے عزیزوں، دوستوں اور ہمعصروں کی تحریروں کا مطالعہ لازمی ہے ان بزرگوں نے ڈاکٹر صاحب کو قریب سے دیکھا اور سمجھا ہے اور ان سے کچھ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۳) ڈاکٹر صاحب کے چھوٹے بھائی یوسف حسین خاں صاحب اپنی کتاب "یادوں کی دنیا" میں لکھتے ہیں۔ ہمارے تیسرے بھائی ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ہیں جنہیں ان کے چھوٹے بھائی ذاکر میاں کہتے ہیں، وہ ہمارے لئے فخر خاندان ہیں۔ ان کی پیدائش ۱۸۹۷ء میں حیدرآباد میں ہوئی۔ ماسٹر عبدالغنی جو ایک نومسلم انگریز تھے ان کے پہلے استاد تھے اٹاوہ سے میٹرک کرنے کے بعد یہ علی گڑھ ۱۹۱۳ء میں ایم اے، او کالج میں ایف۔ ایس سی کلاس میں داخل ہوئے اس کے بعد ڈاکٹری کی تعلیم کے لئے لکھنؤ گئے لیکن صحت کی خرابی کے باعث پھر علی گڑھ آ گئے اور بی، اے میں داخلہ لے لیا ۱۹۲۰ء میں ترک موالات کی تحریک میں شریک ہو کر جامعہ ملیہ اسلامیہ چلے آئے یہ ان کی زندگی کا فیصلہ کن موڑ تھا۔ طالب علمی کے

زمانے ہی سے اُن کی ذہانت اور قابلیت کا سکہ اپنے ہم عصروں پر بیٹھا ہوا تھا علمی قابلیت کے علاوہ انکی سیرت کی چمک دمک بھی اپنوں اور غیروں کے لئے جاذب نظر تھی قدرت کو ان سے بڑے بڑے کام لینا تھے جس کی تیاری طالب علمی کے زمانے سے ہی شروع ہو گئی تھی۔ جب وہ ایم اے۔او کالج کی یونین کے وائس پریذیڈنٹ منتخب ہونے جو کسی طالب علم کے لئے سب سے بڑا اعزاز تصور کیا جاتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کا جرمنی میں قیام تقریباً ساڑے تین سال رہا اگرچہ ان کا خاص مضمون معاشیات تھا لیکن فلسفۂ تعلیم سے انہیں ہمیشہ لگاؤ رہا۔ جرمنی میں اس موضوع کے بڑے ماہر موجود تھے ان کی صحبت میں انہیں اپنی علمی پیاس بجھانے کا موقع ملا جس کے باعث ان کی شخصیت کا خاص رنگ نکھرا اور اس کے اظہار کی نت نئی شکلیں آئندہ پیدا ہوئیں جرمنی کے جن پروفیسروں سے انہوں نے خصوصی علمی استفادہ کیا ان میں زومبارٹ، زیرنگ، اشپرانگر، کوئلر، پروفیسر متھوش اور کرشن اسٹائنو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے فن کا امام مانا جاتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے برلن یونیورسٹی سے ۱۹۲۶ء میں معاشیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

ڈاکٹر صاحب برلن میں ہندوستانی طلباء کی انجمن کے صدر تھے ہندوستان کی آزادی کے متعلق ان کی تقریریں جو انہوں نے جرمن زبان میں کی تھیں بے حد پسند کی گئیں۔ ہیمبرگ اور ہر جگہ میں "انجمن خواتین برائے امن و آزادی" کے زیر اہتمام جو تقریریں انہوں نے گاندھی جی سے متعلق کی تھیں انہیں گاندھی جی کے مضامین کے جرمنی ترجمے میں دیباچے کے طور پر شائع کیا گیا ہے۔

اس زمانے میں برلن میں فارسی زبان کی کتابوں کی طباعت کے لئے ایک مطبع غنی زادہ نے قائم کیا تھا جس کا نام کاویانی پریس تھا۔ مطبع کے مہتمم غنی زادہ سے ڈاکٹر میاں کے دوستانہ مراسم تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان سے یہ خواہش ظاہر کی کہ کمپوزنگ کا کام سیکھنا چاہتا ہوں غنی زادہ نے کہا کہ بہت اچھا پریس حاضر ہے چنانچہ یہ کمپوزنگ سیکھنے کے لئے کاویانی پریس جانے لگے جب کافی مہارت ہو گئی تو اپنے ہاتھ سے دیوان غالب کمپوز کر کے وہیں سے شائع کیا اور اس کے اخراجات اپنی جیب سے برداشت کئے۔ یہ دیوان چھوٹے سائز پر ہے کاغذ نہایت اعلیٰ درجہ کا لگایا گیا۔ بیلدار جدول اور دورنگی چھپائی نے اسے نہایت دیدہ زیب سا دیا ہے ایسا کہ اس شان کا دیوان غالب اس سے پہلے کبھی نہیں چھپا تھا۔ فروری ۱۹۲۶ء میں جرمنی سے واپسی پر ڈاکٹر صاحب جامعہ کے پرنسپل مقرر ہوئے۔

"استاد بردار کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب کے اسلوب کی تازگی برجستگی اور متانت اور خوش بیانی تاثیر کلام کی ضمانت ہیں صفحے کے صفحے پڑھ جائیے زبان و بیان میں تصنع کہیں نام کو نہیں

آمد ہی آمد ہے آورد کا کہیں پتہ نہیں" وہ بڑے منکسر المزاج اور متواضع اور بڑے متحمل اور صابر ہیں۔ مزاج میں چشم پوشی، درگزر اور انصاف پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہے ہر معاملے میں قطعی رائے رکھتے ہوئے اس کے اظہار میں اس کا خیال رہتا ہے کہ کسی کے دل کو چوٹ نہ لگے۔ نہ کسی کی ذلت و توہین ہو۔"

"نوجوانی میں ذاکر میاں کی سیرت و کردار پر ایک صوفی اور درویش حسن شاہ کا گہرا اثر پڑا۔ جو ہمارے دادا کے دور کے سرپرست ہوتے تھے۔ بڑی خوبیوں کے انسان تھے اور اپنے رنگ میں منفرد۔ حسن شاہ ہم سب بھائیوں میں ذاکر میاں کو بہت چاہتے تھے۔ ان سے اپنی فارسی کی کتابیں جو تصوف پر تھیں نقل کرواتے۔ ذاکر میاں کا کہنا ہے کہ اس نقل کرنے کے سبب سے میرا خط اچھا ہو گیا"

ذاکر میاں کی ہی زندگی ہمیشہ سے پاک وصاف رہی ہے اس میں ہر بات ظاہر ہے کوئی چیز چھپی نہیں۔ وہ جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں اگر وہ کسی سے وعدہ کریں تو اسے پورا کریں گے وہ ہر ایک کام کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ بشرطیکہ یہ جائزہ اور درست ہو۔ ذاکر میاں کی صداقت بڑے چھوٹے سب مانتے ہیں۔ اپنے پرائے سب اس کی گواہی دیتے ہیں اس سے ان کے کردار کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔"

پروفیسر حبیب الرحمٰن صاحب ہائی اسکول اور کالج کی تعلیم کے ساتھی تھے۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون "تعلیمی دور" میں لکھا ہے کہ ذاکر صاحب کو میں ۱۹۱۳ء سے جانتا ہوں۔ جب وہ اور میں اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ میں پڑھتے تھے ذاکر صاحب کو ان کے بی اے ایم، اے اور کالج کے ساتھی مرشد بھی کہتے ہیں اور سمجھتے بھی ہیں لیکن ذاکر صاحب اسکول کے زمانے میں بھی اپنے اسکول کے ساتھیوں کے مرشد تھے۔ ہر طالب علم ان کی پیروی کرتا تھا اور ان کی تقلید کرنے میں فخر محسوس کرتا تھا جس زمانے میں ذاکر صاحب اور میں اسلامیہ کالج اٹاوہ میں پڑھتے تھے ترکی اور اٹلی میں جنگ ہو رہی تھی ذاکر صاحب کی تحریک پر ہم لوگوں نے گوشت کھانا بند کرا دیا تاکہ جو روپیہ بچے ترکوں کی مدد کو بھیجا جائے مرشد کو اس زمانے میں بھی انگریزی اخبار پڑھنے کا شوق تھا "پانیر" معیاری اخبار سمجھا جاتا تھا۔ انہیں جلد سے جلد خبریں معلوم کرنے کی اتنی فکر اور اس قدر اشتیاق رہتا کہ وہ پانیر روزانہ خریدنے کے لئے اٹاوہ کے اسٹیشن جاتے۔ آگے وہ ہوتے پیچھے میں اسٹیشن پر اخبار اترتے ہی ذاکر صاحب اسے حاصل کرتے۔ اور پھر وہ اور میں تقریباً بھاگتے ہوئے اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں واپس آجاتے۔ وہاں طالب علم منتظر ہوتے ہمارے واپس آتے ہی وہ ہمارے چاروں طرف حلقہ بنا لیتے ذاکر صاحب انہیں خبروں کا ترجمہ کر کے سناتے بلکہ ان پر تبصرہ بھی فرماتے۔

"ہمارے ہیڈ ماسٹر الطاف حسین دہیں اور ہونہار طالب علموں کو اپنی ذاتی توجہ کا مرکز بنا لیتے۔

یہ طالب علم جن میں ذاکر صاحب سب سے زیادہ نمایاں تھے اپنا فاضل وقت ہیڈ ماسٹر صاحب کے مکان پر صرف کرتے اور ہیڈ ماسٹر صاحب مختلف سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل پر ان طالب علموں کے ساتھ ایسے دلچسپ انداز میں گفتگو کرتے تھے کہ ان میں ان مسائل کے متعلق کافی بصیرت پیدا ہو جاتی تھی اور ان کے علم اور واقفیت میں کافی اضافہ ہوتا تھا ہیڈ ماسٹر صاحب کی ان مجلسوں اور صحبتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ذاکر صاحب کی عام واقفیت سیاسی مسائل کے متعلق اتنی وسیع ہو گئی کہ بیشتر اعلیٰ تعلیم حاصل کئے ہوئے لوگ جو ان سے دوگنی عمر کے تھے۔ ان مسائل کے متعلق ان جیسی بصیرت نہ رکھتے تھے اس بصیرت کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان میں بین الاقوامی اور قومی معاملات کے صحیح جذبات اور رجحانات پیدا ہو گئے اور ہندوستان کے باہر دوسرے مسلم ممالک سے ان کی گہری ہمدردی بھی راسخ ہو گئی

پروفیسر مجیب کے ذاکر صاحب سے انتہائی قریبی اور گہرے تعلقات تھے۔ ۱۹۲۳ء میں پروفیسر مجیب کی برلن میں ذاکر صاحب سے پہلی ملاقات ہوئی ۱۹۴۸ء میں جب ذاکر صاحب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہو کر علی گڑھ گئے تو مجیب صاحب ان کے جانشین مقرر ہوئے اور اس وقت سے اب تک وہی شیخ الجامعہ کے فرائض انجام دے رہے ہیں پروفیسر مجیب نے ذاکر صاحب کے متعلق ایک مضمون "ڈاکٹر ذاکر حسین ۔۔۔ ایک خاکہ" میں لکھا ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں بہت ہر دل عزیز تھے۔ لیکن ان کی تعریف کرنے والوں میں کسی کو گمان نہیں تھا کہ ان میں علم حاصل کرنے کا کوئی حوصلہ ہے ان کی شخصیت میں بڑی کشش تھی ان کی گفتگو بڑی پُرلطف ہوتی تھی دنا صحت میں تیز تھے۔ وہ بہت عجیب عجیب اور دل کش حرکتیں بھی کرتے تھے مثلاً ایک مرتبہ وہ کسی معجون کا مرتبان کھا گئے اور بڑے بھولے پن سے اس کی وجہ یہ بتائی کہ میں کیا کرتا بھوک لگی تھی۔ ان کی تعریف کرنے والوں میں کسی کو اس کا بھی خیال نہ ہوا کہ ان کا لاابالی پن ظاہری ہے۔ اور ان کی طبیعت کی گہرائی میں اور بہت کچھ ہے جس کا پتہ نہیں چلتا۔"

ذاکر صاحب کے ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب سے بھی دیرینہ تعلقات تھے۔ ان سے بھی پہلی ملاقات برلن میں ہوئی جہاں عابد صاحب طالب علم تھے ڈاکٹر عابد حسین صاحب "ذکر ذاکر" میں لکھتے ہیں۔ "ہم سنا کرتے ہیں کہ فلاں شخص نے دوستوں عزیزوں یا عام طور پر بندگان خدا کی خدمت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ فلاں نے قوم و ملت کے لئے اپنی زندگی کو وقف کر دیا ہے۔ دنیا کو تج دیا ہے ایثار کیا ہے، قربانی کی ہے۔ ذاکر صاحب کو میں نے پچھلے ۴۴ سال سے ہمیشہ افراد اور جماعتوں کی بھلائی کی کوشش میں محو دیکھا ہے۔ لیکن میرے علم و یقین میں نہ انہیں کبھی خدمت کا بیڑا اٹھانے کا احساس ہوا

نہ اپنے آپ کو وقف کرنے کا نہ تیاگ کا نہ ایثار و قربانی کا احساس ہوا تو صرف یہ کہ زندگی کا دھارا خود بخود بے تکلف، بے رکاوٹ ایک سمت بہہ رہا ہے اور انہوں نے کہا اچھا ہے بہنے دو سماجی یا انسانی دوست ٹائپ کی ایک اور بڑی پہچان ہے اور وہ بھی ذاکر صاحب میں بدرجہ اتم موجود ہے ان میں "خودی" اور "بے خودی" اس طرح گھل مل کر شیر و شکر ہو گئی کہ دوسرے انسانوں کے مقابلے میں خواہ کسی ملک، کسی مذہب کسی طبقے کے ہوں انہیں احساس کمتری اور اظہار برتری کی کشمکش سے گزرنا، خود فروشی اور خود فراموشی کے بیچ میں جھولنا نہیں پڑتا نئے آدمی سے وہ اس طرح کھلے آغوش اور کھلے دل سے ملتے ہیں جیسے برسوں کا دوست ہو انسان کو کتاب سمجھ کر اس کی تنقید، تحلیل اور تجزیہ نہیں کرتے کہ وہ کسی جزو کو رد اور کسی کو قبول کریں۔ بلکہ جیسا ہے سارے کا سارا لے لیتے ہیں اور اپنے کو تمام و کمال اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اور ہمارے زمانے میں گاندھی جی نے اس پر بہت زور دیا ہے کہ بُرے آدمی اور اس کی بُرائی میں فرق کرو۔ اس طرح جیسے بیمار اور بیماری میں کرتے ہو بُرائی کو ضرور بُرا کہو اور رفع کرنے کی کوشش۔ اس طرح جیسے بیمار اور بیماری میں کرتے ہو مگر اس انسان کو جس کے اندر بُرائی نظر آئے بیمار کی طرح ہمدردی کے قابل علاج کا محتاج، محبت کا سزاوار سمجھو اس اصول پر اپنی طبیعت کے تقاضے سے عمل کرتے ہوئے میں نے کسی کو دیکھا ہے تو ذاکر صاحب کو بُرے اعمال کی وجہ سے کسی کو بُرا سمجھنا تو درکنار، ذاکر صاحب کی اتھاہ مروت اکثر انسان کے جوہر انسانیت کی اس کے بُرے اعمال کو قبول نہیں تو گوارا ضرور کر لیتی ہے کسی کے دل کو ہاتھ میں لینا ان کی طریقت میں حج اکبر ہے اور کسی کے دل کو توڑنا گناہ کبیرا بلکہ کفر ہے ان کی طبیعت حوصلہ مند ہے اور قومی اعزاز، اجتماعی منصب بے مانگے ملے تو ان کا دل قبول کرنے کو چاہتا ہے لیکن اگر اس میں کسی حریف کا مقابلہ کر کے اس کو شکست دینا ہو اور کسی انسان کو روند کر آگے بڑھنا ہو تو وہ عموماً پیچھے ہٹ جاتے ہیں"

پروفیسر رشید احمد صدیقی کے متعلق کسے معلوم نہیں کہ یہ ڈاکٹر صاحب کے سب سے قریبی ساتھی اور یار غار ہیں رشید صاحب نے سب سے پہلے ذاکر صاحب پر ایک چھوٹی سی کتاب "ذاکر صاحب" لکھ کر عوام سے انہیں روشناس کرایا۔ اس کے بعد وہ ذاکر صاحب پر برابر علی گڑھ کالج میگزین میں مضمون لکھتے رہے زیر نظر اقتباس بھی علی گڑھ کالج میگزین میں ایک مضمون "یاد یار مہرباں آید ہمی" سے ماخوذ ہے"

" ذاکر صاحب کے وائس چانسلر ہونے سے پہلے ایسا کچھ ایسا حال تھا کہ ملک یا ملک سے باہر کوئی مشہور شخص یا اپنے فن یا مسلک کا کامل نظر آ جاتا تو یہ فکر دامن گیر ہوتی کہ جہاں کی رفاقت یا راہ نمائی

لئے کس کا انتخاب کیا جائے تاکہ ہمارا بھرم قائم رہے اور مہمان خوش مطمئن اور اس ادارے کی خوبیوں کا معترف ہو کر رخصت ہو بات یہ ہے کہ اتنے دنوں سے اپنی یونیورسٹی کو یونیورسٹی کے درجہ سے گرتے اور طرح طرح کے فضیحتوں سے دو چار ہوتے دیکھ چکا تھا کہ آپ اپنی نظر میں سبک ہو چلا تھا کہ اپنی روایات اور اپنی قوم اپنی یونیورسٹی یہاں تک کہ اپنے بزرگوں، عزیزوں اور دوستوں کے بارے میں محبت اور عظمت کی جو رائے رکھتا تھا وہ شاید خود فریبی تھی جس نے میرے احساسات کے احترام میں خوش عقیدگی کا جامہ پہن لیا تھا لیکن جب ذاکر صاحب آ گئے تو ایک ایک کر کے میری تمام خوش عقیدگیوں کی تصدیق ہونے لگی۔ اور پھر ایک دفعہ کالج والی طالب علمانہ یا طفلانہ سپرٹ عود کر آئی کہ کاش کوئی بڑا آدمی آئے اور ہم کو ہمارے ادارے کو اور ہمارے بڑے آدمی کو دیکھے۔ چنانچہ اس سات آٹھ سال میں جب تک ذاکر صاحب یہاں رہے جب کبھی یہ سنتا کہ فلاں بڑا آدمی آ رہا ہے اور اس زمانے میں کتنے بے شمار منتخب روزگار یہاں آئے تو دل خوش ہو جاتا تھا اور حوصلہ بڑھ جاتا تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ بڑا آدمی تھا بلکہ اس لئے کہ ہم کو اپنی بڑائی ثابت کرنے کا موقع ملے گا۔ چنانچہ یہ یقین رہتا تھا کہ مہمان کسی اعتبار سے کتنا ہی عظیم المرتبت کیوں نہ ہو، ذاکر صاحب اس سے ملے اور گفتگو کرلی تو وہ ہمیشہ ہمارا اور ہمارے ادارے کا اور ہم جس بات کی نمائندگی کرتے ہیں اس کا ثنا خواں رہے گا۔

ذاکر صاحب کے ایک اور قریبی دوست اور عقیدت مند خواجہ غلام السیدین نے ذاکر صاحب پر ایک طویل مضمون "مرد مومن" کے عنوان سے لکھا ہے اس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے

"میرے خیال میں ذاکر صاحب کی سب سے نمایاں صفت انسانی زندگی کی قدروں کی صحیح پرکھ ہے وہ کاموں اور مقصدوں کی اضافی قدر و قیمت کا بہت صحیح اندازہ لگاتے ہیں۔ بہت سی چیزیں جو دوسرے لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہیں، ان کی نگاہ اور ان کے دل کو کبھی مرعوب نہیں کر سکتیں یہ بظاہر معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن دراصل کم یاب صفت ہے اور خوش نصیب ہے وہ انسان جو آزمائشوں اور تجربوں کی یورش میں اپنے نظام اقدار کو درست رکھے اور اس کی حفاظت کر سکے دراصل تعلیم کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانی قدروں کی پرکھ سکھائے اس لئے ایک اچھے معلم کے ذہن میں انسان اور اس کی دنیا کی صحیح تصویر ہونی چاہئے تاکہ وہ اہم اور غیر اہم، اصلی اور نقلی، سچی اور جھوٹی باتوں میں تمیز کر سکے اگر اس کے خیال اور عمل میں غلط اور کم معیاری چیزوں کی عزت اور محبت بسی ہو گی تو اس کے شاگرد بھی خود بخود انہیں چیزوں کا احترام کریں گے۔

ذاکر صاحب کی عظمت بحیثیت ایک معلم کے دراصل اس وجہ سے نہیں کہ ان کو موجودہ اور قدیم تعلیمی اصولوں اور طریقوں سے بہت اچھی واقفیت ہے یا انہوں نے ایک بہت مشہور درسگاہ کی بنیاد ڈالی ہے اور اس کو پروان چڑھایا ہے بلکہ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ان کی اپنی ذات ہماری بہترین اخلاقی اور مذہبی قدروں کی حامل ہے اور عصر حاضر کے شیطانی ہیجان میں انہوں نے اپنے مذاق سلیم اور احساس صالح کو قائم رکھا ہے اور یہ چیز علم و عمل کے کارناموں سے بھی کہیں زیادہ وسیع ہے۔

مشہور نقاد پروفیسر آل احمد سرور بھی ذاکر صاحب سے بے پناہ محبت اور ہمہ گیر عقیدت رکھتے ہیں۔ سرور صاحب نے ان کی شخصیت اور علمیت کا اثر قبول کیا ہے اور رہنمائی حاصل کی ہے۔ سرور صاحب نے اپنے بارے میں لکھا ہے کہ ذاکر صاحب نے آئی سی ایس سے ان کی طبیعت ہٹائی اور علمی کے درس و وقار کی طرف مائل کیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی ادبی خدمت کا ذکر کرتے ہوئے آل احمد سرور لکھتے ہیں —— انہوں نے جوش جنوں میں بارہا گھر چھوڑ کر جنگل کی راہ لی اور اپنے خون دل سے سینچ ہی ویرانوں میں علم و عمل کے پھول کھلائے۔ انہوں نے کتابوں میں کبھی اپنے آپ کو بند نہیں کیا۔ مگر جب کبھی کچھ لکھا تو اپنے خلوص دل سوزی اور سماجی شعور کی وجہ سے وہ ایسی بوئی بجلیاں بھر دیں حسن کی وجہ سے ادب میں آب آتی ہے اور جس سے انسانوں کی زندگی بدلتی، سنورتی اور نکھرتی ہے۔

ذاکر صاحب نے اپنی عوامی زندگی میں بہت سے حیرت انگیز کارنامے انجام دئے ہیں مثلاً ۱۹۴۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں کو جب کہ ان میں شدید کشمکش تھی اور ایک دوسرے کی صورت دیکھنا بھی گوارہ نہیں تھا۔ ذاکر صاحب کی محبوب شخصیت نے جامعہ کے پلیٹ فارم پر اکٹھا کر دیا۔ اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ آج جبکہ اکثریتی فرقے کے کانگریسی امیدواروں کی کامیابی یقینی نہیں سمجھی جاتی۔ اقلیتی فرقے کے ایک فرد کی ملک کے سب سے بڑے عہدے کے لئے کامیابی یقیناً حیرت انگیز ہے۔ اسے ذاکر صاحب کی شخصیت کی سحر کاری کہہ سکتے ہیں یا پھر ان کے ارادوں اور مقاصد کا خلوص جو اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہتا۔"

اور مولانا عبدالماجد دریابادی نے ذاکر صاحب کے صدر منتخب ہونے پر کہا "ہندوستان نے ایک مسلمان کو صدر جمہوریہ منتخب کر کے کچھ تو لاج اپنے سیکولر ہونے کی رکھ لی اس پر مبارکباد کے مستحق جناب صدر موصوف نہیں ان کے منتخب کرنے والے ہیں۔

ہمارے ذاکر صاحب کی سیرت و کردار کا خلاصہ کوئی ایک لفظ میں اگر رکھ دینا چاہے تو وہ ایک

شرافت ہوگا شرافت نفس کے نمونے یوں تو وہ زندگی بھر اور بکثرت پیش کرتے رہتے ہیں لیکن اس کا سب سے بڑا اور سب سے پُراثر مونہ تو عیاں اسی الیکشن کے سلسلے میں دیکھنے میں آیا۔

۱۹۶۸ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی ۱ ، ویں سال گرہ تھی اس موقع پر ایک مجلس مدرذاکر قائم ہوئی تاکہ بلحاظ ایک فاضل و صاحب علم شخص کے اور کیا بہ حیثیت صدر جمہوریۂ ہند کے ایک یادگاری کتاب ان کی خدمت لیں پیش کی جائے جس میں ان کے کارناموں اور ان کی مدت العمر کی ملکی خدمت کا اعتراف ہو۔ اور جس میں ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے علما یا مصنفین کے فاضلانہ مقالات انگریزی اور اردو بھی شامل ہوں

اس مجلس کے صدر ملک کے ممتاز دانشور ڈاکٹر تارا چند تھے انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو خراج عقیدت اس طرح پیش کیا ہے ۔

صدر کی شخصیت، دانش مندی اور معقولیت حکومت کے خیالات کو بے حد متاثر کرتی ہے حکومت کے اقدامات اور اس کی پالیسیوں کی کامیابی کا انحصار بھی بڑی حد تک اس کی رایوں پر ہوتا ہے۔ اور اسی کی رایوں کی مدد سے بہت سے ناخوش گوار حالات ختم ہو جاتے ہیں

ان ملند اور قابل احترام آدرشوں کی حفاظت و تکمیل کے لئے ڈاکٹر ذاکر حسین بہترین اوصاف سے آراستہ ہیں قدرت نے انہیں انتہائی فیاضی سے وہ تمام صلاحیتیں بخشی ہیں جو کامیابی کی ضامن ہوتی ہیں، توازن قوت فیصلہ انسانیت دوستی دانشمندی کے وہ اوصاف جو صدارت کے منصب پر فائز ہونے والے میں ہونا چاہئیں سب کے سب ان کی شخصیت کے اجزا ہیں ان اوصاف کو ان کے طویل تجربے سے پختگی ملی ہے

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لئے

(ماخوذ)

"حکمراں صبر کرتے ہیں اور اچھا استاد صبر کرتا ہے"

(ڈاکٹر ذاکر حسین)

ڈاکٹر ذاکر حسین ــــــ اور سیاست

سید مسعود الحسن (بی ایڈ)

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن اُن کی شخصیت کے جس پہلو کی طرف سب سے کم نظر گئی ہے وہ اُن کی شخصیت کا سیاسی پہلو ہے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کو سیاست سے بچپن سے ہی دلچسپی تھی جب وہ اٹاوہ مسلم ہائی اسکول کے طالب علم تھے پہلی جنگ عظیم ہو رہی تھی وہ سرور اپنے ایک دوست کے ساتھ اسٹیشن جاتے اور وہاں سے انگریزی اخبار لاتے اور اپنے ساتھیوں کو نہ صرف اس کا ترجمہ کر کے سناتے بلکہ اس پر تبصرہ بھی فرماتے جاتے ڈاکر صاحب مرحوم کے اس زمانے کے ایک ساتھی اور دوست پروفیسر حبیب الرحمٰن لکھتے ہیں کہ سیاسی مسائل سے متعلق ڈاکر صاحب کی عام معلومات اور واقفیت اتنی وسیع ہو گئی کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کئے ہوئے لوگ جو ان سے دوگنی عمر کے تھے ان مسائل کے متعلق ان جیسی بصیرت نہ رکھتے تھے ڈاکر صاحب کی سیاست سے یہ دلچسپی ایک حد تک، ان کے استاد اور اسکول کے ہیڈ ماسٹر الطاف حسین صاحب کی تعلیم کا نتیجہ تھی۔

ذاکر صاحب کی سیاست سے اسی دلچسپی کا نتیجہ ان کا افلاطون کی شہرۂ آفاق کتاب "ریاست" کا ترجمہ تھا ڈاکٹر صاحب نے صرف اس کا ترجمہ ہی نہیں کیا تھا بلکہ ان کے سیاسی خیالات خود بھی افلاطونیت کا جامہ پہنے ہوئے تھے، بقول سرور صاحب "ذاکر صاحب طبیعتاً افلاطونی ہیں" ریاست کا مقدمہ پڑھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ افلاطون خود بول رہا ہے اور کتاب دیکھیں تو ترجمہ نہیں معلوم ہوتی شاید افلاطون اور ذاکر صاحب میں بہت سی خصوصیات مشترک ہوں چنانچہ اصل مصنف کی روح نے مترجم کی ذات میں یوں حلول کیا تھا کہ قارئین کے لئے مصنف اور مترجم میں فرق کرنا مشکل ہے افلاطون کی ریاست ڈاکٹر ذاکر کی ریاست بن گئی ہے، کتاب ساری مکالموں میں ہے اور ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ مکالمات ڈاکٹر ذاکر کے اپنے لگتے ہیں جیسے کہ ان کی اپنی کہی ہوئی بات ہے جو وہ اپنے دوستوں اور شاگردوں سے کہہ رہے

اس بات وہی ہے بات کہنے کا ڈھنگ وہی ہے اگر ہم تناسخ کے قائل ہوتے تو ضرور کہتے کہ افلاطون کی روح نے دوبارہ ریاست کے اُردو مترجم کا جسم لیا ہے اور شاید یہ بات ہو بھی سچ افلاطون کے عہد کا یونان کم سے کم ذہنی اور سیاسی انتشار میں ہندوستان سے بہت حد تک ملتا جلتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو قریب قریب سبھی قومی اور ملی لیڈروں سے سابقہ رہا لیکن ان کی شخصیت پر قابل ذکر اثر صرف چند ہی لیڈروں کا پڑا خاص طور سے گاندھی جی اور حکیم اجمل خاں کا گاندھی جی کی حق شناسی حق بینی حق گوئی اور انسان دوستی کی آنچ نے آکر سونے کو کندن بنایا تو حکیم اجمل خاں کے حلم، مروت، صبر اور حلم نے اس پر جلا دی ان اکابرین کے علاوہ ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر انصاری اور مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی متاثر تھے مولانا آزاد کے انتقال کے بعد انہوں نے ایک تقریر میں کہا تھا کہ "سیاست کے میدان میں اس دور میں مولانا کی شخصیت میرے لئے روشنی کا مینارہ تھی کیونکہ اس میں مولانا آزاد ہی ایک ایسے لیڈر تھے جن کے پائے استقامت میں کبھی لغزش نہیں ہوئی اور وہ کبھی اپنے جادۂ منزل سے نہیں ہٹے" اور یہی ڈاکٹر صاحب مرحوم کا بھی نصب العین تھا۔ ان کے ایک بھائی تقسیم کے بعد پاکستان میں جا بسے تھے انہوں نے ڈاکٹر صاحب پر بہت زور ڈالا کہ آپ بھی پاکستان چلیں لیکن ڈاکٹر صاحب نے پاکستان جانے سے انکار کر دیا اور فرمایا اگر ہندوستان کے تمام مسلمان پاکستان جا سکتے ہیں اور وہاں کے تمام ہندو ہندوستان آ سکتے ہیں تو میں پاکستان جانے کو تیار ہوں غرض وہ قول کے سچے اور دھن کے پکے انسان تھے ان کی منزل ایک تھی اور وہ ایک ہی رہی۔

۱۹۴۷ء کا قیامت خیز ہنگامہ ڈاکٹر صاحب کے لئے سخت روحانی کرب کا زمانہ تھا لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور زخمی دلوں پر مرہم رکھنے کے کام میں تندہی سے لگ گئے کیونکہ وہ کبھی بھی انسانوں کی انسانیت سے مایوس نہیں ہوئے تھے ان کا قول تھا کہ اس میں بڑا مزہ ہے کہ آدمیوں کے متعلق اچھے سے اچھا گمان رکھے ہر روز فریب کھائے ہر روز آدمیوں کی نیک دلی پر یقین رکھے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کو قدروں کا بار بار بدلنا بہت برا معلوم ہوتا تھا وہ سیاست سے قریب ہوتے ہوئے بھی موجودہ سیاست سے بہت دور تھے انہیں آج کل کی سیاست سے جو گھٹیا پن اور حد ناشناسی سے بیر ہے چڑھ تھی اپریل ۱۹۴۲ء میں انہوں نے قومی تعلیم کی دوسری کانفرنس سے جو خطاب کیا تھا اس سے ان کے سیاسی تصورات اور زیادہ واضح ہوتے ہیں اس میں انہوں نے ڈاکٹر راجندر پرشاد کی معرفت سیاسی رہنماؤں سے اپیل کی تھی کہ۔

خدا کے لئے اس ملک کی سیاست کو سدھاریئے اور جلد سے ایسی ریاست کی طرح ڈالئے جس میں قوم

قوم پر بھروسہ کر سکے کمزوروں کو زور آور کا ڈر نہ ہو غریب امیر کی ٹھوکر سے بچا رہے جس میں تمدن، تمدن کے ساتھ پہلو بہ پہلو پھول پھل سکے اور ہر ایک سے دوسرے کی خوبیاں اجاگر ہوں جہاں ہر ایک وہ بن سکے جو بننے کی اس میں صلاحیت ہے اور وہ مل کر اپنی ساری قوت کو سماج کا کر جائے۔

وہ چاہتے تھے کہ ایک ایسا سماج بنایا جائے جس میں بھائی بھائی ایک دل نظر آئے کوئی قدر آخری قدر ہو جس میں کوئی گیت ہو جو سب مل کر گائیں کوئی تہوار ہو جو سب مل کر منائیں، کوئی شادی ہو جو سب مل کر رچائیں کوئی دکھ ہو جو سب مل کر بانٹیں

۱۹۵۲ء میں جب ہندوستان میں پہلا الیکشن ہو رہا تھا تو پنڈت نہرو نے ایک جگہ تقریر کرتے ہوئے بڑے دکھ کے ساتھ کہا تھا کہ لوگ میرے پاس ممبری کے لئے ٹکٹ مانگنے آتے ہیں کہ اس طرح سے ملک کی خدمت کریں لیکن تعلیمی اور سماجی فلاح و بہبود کے کاموں کے میدان میں کوئی خدمت انجام دینا نہیں چاہتا۔ اس تقریر کو سن کر ذاکر صاحب نے پنڈت نہرو کو ایک خط لکھا تھا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ آپ مجھے ان لوگوں کی فہرست میں نہیں پائیں گے جو صرف سیاست کے میدان میں ملک کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اس بات سے پنڈت نہرو کو بڑی خوشی ہوئی اور وہ بڑے متاثر ہوئے تھے۔

۱۹۵۲ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کی وائس چانسلری سے صحت کی خرابی کی بنا پر استعفیٰ دینے کے بعد مولانا آزاد کی خواہش اور پنڈت نہرو کے اصرار پر ۱۹۵۷ء کے وسط میں وہ بہار کے گورنر ہو گئے یہاں بھی ان کا کام یہ تھا کہ سیاسی کشمکش کی آنچ کو ٹھنڈا کرتے رہیں اس خدمت کو ذاکر صاحب نے اس خوبی سے انجام دیا ہے کہ ۱۹۶۲ء میں وہ جمہوریۂ ہند کے نائب صدر اور راجیہ سبھا کے چیئرمین مقرر ہوئے ان پانچ برسوں میں ذاکر صاحب نے اپنے فرائض کی بحسن و خوبی انجام دہی کے علاوہ دوسرے ممالک میں امن و محبت کے سفیر کی حیثیت سے دورے بھی کئے اس میدان میں ان کی خدمات کا ملک و قوم نے اس طرح اعتراف کیا کہ انہیں ہندوستان کے سب سے بڑے خطاب بھارت رتن سے نوازا۔

ملک میں ۱۹۶۷ء کے سیاسی حالات ذاکر صاحب جیسی دور اندیش اور حساس طبیعت کی نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکے چنانچہ انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ دوبارہ نائب صدر کے عہدے کے لئے نہیں کھڑے ہوں گے لیکن کانگریس پارٹی نے انہیں اپنا صدارتی امیدوار نامزد کر دیا پہلی دفعہ ہندوستان میں صدارت کے لئے باقاعدہ مقابلہ ہو رہا تھا تمام مخالف پارٹیاں کانگریس کے امیدوار کی مخالفت کر رہی تھیں یہ ذاکر صاحب ہی کی شخصیت تھی کہ ان سب باتوں کے باوجود وہ ایک بڑی اکثریت سے جمہوریۂ ہند کے صدر چُن لئے گئے۔

ذاکر صاحب کی پوری زندگی ہمارے سیاست دانوں کو سبق دیتی ہے کہ سیاست کو اخلاقی قدروں سے منسلک کرکے ہی ہم ایسے معاشرے کو جنم دے سکتے ہیں جس میں صحیح معنی میں اچھے ہندوستانی اور بہترین آدمی بن سکیں آج کے بہت سے سیاسی لیڈروں کے برعکس ذاکر صاحب نے ہمیشہ تکلیف کو راحت پر خدمت کو حکومت پر اور ایثار کو دولت پر ترجیح دی۔

غرض ان کی شخصیت میں وہ توازن جاری اور ساری تھا جو یونان کے فلسفیوں اور اسلام کے معلمین اخلاق کی نظر میں انسانیت کا بہترین جوہر ہے بلاشبہ ذاکر صاحب کی شخصیت پر حکیم مشرق علامہ اقبال کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

"سیاست، حکم و جود قومی کی تمنا ہے، فطرتاً بے تاب۔ تعلیم اقدار مطلقہ کی عاشق ہے لازماً صبر طلب۔ تعلیم ان اعلیٰ اقدار کو تازہ اور ستادا رکھتی ہے اور پیدا کرتی ہے۔ سیاست ان کو تسلیم کرتی ہے اور حفاظت۔ اس لئے وہ مخدوم ہے اور یہ خادم۔ سیاست شدت چاہتی ہے، تعلیم مدت۔ سیاست کے پروگرام آئے دن بدلتے رہتے ہیں، تعلیم کا پہلا منصوبہ ہی اتنا ہمہ گیر ہے کہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اس کی منزل پہنچنے کے لئے نہیں ہے، راہ رو کا رُخ متعین کرتی ہے۔

(ڈاکٹر ذاکر حسین)

ڈاکٹر ذاکر حسین اور تعلیم ——— ایک ببلیوگرافی

جمیل احمد قریشی

ذاکر صاحب بہار کے گورنر بھی رہے اور نائب صدر اور صدر جمہوریہ کی حیثیت سے بھی ملک و قوم نے انہیں دیکھا مگر ان کی حیثیت کی اصل بنیاد تعلیمی کاموں سے ان کی دلچسپی تھی جامعہ، تعلیم کا مقصد استاد کا منصب، اسکول کا فرض نوجوانوں کی ذمے داریاں بچوں کی تربیت، تعلیم اور اس سے متعلق بہت سے دوسرے موضوعات پر انہوں نے جو کچھ کیا اور لکھا ہے اس سب کے مطالعے کے بعد ہی ہمیں تعلیمی کاموں سے ان کے لگاؤ اور اس سے ان کے فطری تعلق کا اندازہ ہو سکتا ہے اور ان ہی کے ذریعے ان کے نظریات ان کے عقائد اور ان کے حالات سمجھے جا سکتے ہیں۔

ہمیں خوشی ہے کہ جمیل قریشی صاحب (مرکزی کتب خانہ) نے تعلیم سے متعلق ذاکر صاحب کے تمام افکار و خیالات کی ایک ببلیوگرافی مرتب کر دی ہے جو ہم اپنے اس شمارے میں شائع کر رہے ہیں ہمیں یقین ہے کہ یہ ببلیوگرافی تعلیم اور ذاکر صاحب پر تحقیقی کام کرنے والوں کے بہت مفید ہو گی۔

(مدیر)

- صنعتی تعلیم، جامعہ ا(۱)، جنوری ۱۹۲۳ء ۹۰ ۱۵ (جرمنی میں صنعتی تعلیم سے متعلق) ۲ جنوری ۱۹۲۳ء کو برلن سے ایک خط
- راہ عمل در رسل کی سماجی تعلیم کے اصول سے ترجمہ) جامعہ ا (۴)، اپریل ۱۹۲۳: ۱-۲
- ا- چین میں اعلیٰ تعلیم جامعہ ۲ (۶)، جون ۱۹۲۶ ۲۲۶ ۲۳۴ (پیکنگ یونیورسٹی کے چانسلر کے مضمون کا ترجمہ)
- بیسک نیشنل ایجوکیشن ذاکر حسین کمیٹی رپورٹ، دسمبر ۱۹۳۸، ہندوستانی تعلیمی سنگھ،

واردھا : ۲۲۲ ص انگریزی زبان میں گاندھی جی کے پیش لفظ کے ساتھ کمیٹی کے مندرجہ ذیل ممبر تھے

خواجہ غلام السیدین، کستوری لال مصروالا،
کے، ٹی، شاہ، جے سی، کمارپا، ونوبھاوے،
شری کرشن داس جاجو، کاکا کالیکر، آشا دیوی،
آریونایکم

۵ واردھا تعلیم اسکیم، جامعہ ۲۹ (۳) مارچ ۱۹۳۸ ۲۳۵ ۔ ۲۴۲ (تنقیدوں کا جواب)
۶ دوسری بنیادی تعلیمی کانفرنس جامعہ نگر، نئی دہلی خطبہ ۱۱ر اپریل ۱۹۴۱ء ۱۵
۷ بچوں کی جسمانی نشو و نما۔ پیام تعلیم، ۲۱ر جون ۱۹۲۹
۸ حکومت اڑیسہ کا فیصلہ (بیدرہ بنیادی اسکولوں کو بند کر دینے سے متعلق) ہمدرد جامعہ، اپریل ۱۹۴۱ء
۹ جنگ کے بعد تعلیم جامعہ ۴۴ (۳) ستمبر ۱۹۴۲ ۲۔۹ (آل انڈیا ریڈیو سے ۲۴ر جون ۴۳ کو نشر ہوگا)
۱۰ مولانا آزاد کو اعزازی ڈگری، نئی روشنی دہلی یکم مارچ ۱۹۴۹ء، ۳۰، ۵
یہ تقریر ۲۰ر فروری ۱۹۴۹ کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر کی حیثیت سے مولانا آزاد کو ڈاکٹر آف تھیولوجی کی اعزازی سند پیش کرتے ہوئے کی گئی۔
۱۱ بھارت میں تعلیم کا مستقبل، آج کل دہلی ۱۲ (۵) دسمبر ۱۹۵۳ء ۴۷۔۴۸ نشری تقریر۔
۱۲ علی گڑھ علی گڑھ میگزین علی گڑھ نمبر (مرتبہ نسیم قریشی) ۱۹۵۳ ۱۹۵۵ ۴ ص
۱۳ علی گڑھ ۳ ۱۹ کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی تاریخ کا سلسلہ) علیگ علی گڑھ جنوری ۱۹۵۷، ۸
۱۴ ہندوستان میں تعلیم کی از سر نو تنظیم، (مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین) نیشنل بک ٹرسٹ مئی ۱۹۶۲ء: ۸۸ ص
۱۵ تعلیمی خطبات، مکتبہ جامعہ، دہلی، جولائی ۱۹۶۱ (بار دوم) ۲۸۸ ص
پہلا ایڈیشن مارچ ۱۹۴۳ء میں نکلا تھا جو عبداللطیف اعظمی صاحب نے مرتب کیا تھا

مندرجہ ذیل خطبات۔

قومی تعلیم	کاشی ودیا پیٹھ، ۱۴ر اگست ۱۹۳۵ء
مسلمانوں کی تعلیم	مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ۲۹ر مارچ ۱۹۳۷ء
طبی تعلیم	طبیہ کالج پٹنہ ۱۹۳۸ء
بنیادی تعلیم	بنیادی تعلیمی کانفرنس ۱۱ر اپریل ۱۹۴ء
بچوں کی تربیت (۱)	جامعہ نگر ۱۰ر مارچ ۱۹۳۶ء

۱۵. ٹاٹا ٹرسٹ کا شاہانہ عطیہ — ہمدرد جامعہ، ۱۱ (۴) جولائی ۱۹۴۵ء ۵-۶

۱۶. مبارک مہینے (وظائف کے لئے اپیل) — ہمدرد جامعہ، ۱۱ (۴) جولائی ۱۹۴۵ء: ۱۰-۱۱

۱۷. مسجد جامعہ نگر، — ہمدرد جامعہ، ۱۱ (۴) ۱۹۴۵ء: ۱۰-۱۱ (جوبلی کے موقع پر علیحدہ سے پمفلٹ بھی)

۱۸. جامعہ کیا ہے؟ پمفلٹ، ۱۹۴۶ء

۱۹. جامعہ کے بچوں کے لئے شیخ الجامعہ کا پیغام — پیام تعلیم، دہلی جوبلی نمبر ۲۸ (۲، ۳) نومبر، دسمبر ۱۹۴۶ء ۴۴-۴۷

۲۰. جامعہ والوں سے — جامعہ، ۴۴ (۵) نومبر، دسمبر ۱۹۴۶ء ۵-۷

۲۱. جامعہ کا ترانہ — پیام تعلیم، دہلی، جوبلی نمبر ۲۸ (۲-۳) نومبر، دسمبر ۱۹۴۶ء ۵۵، ۵۷

۲۲. پچیس برس گزر گئے۔ — جامعہ ۴۴ (۵) نومبر، دسمبر ۱۹۴۶ء ۵-۷

۲۳. جامعہ کے نام بچوں کے نام — پیام تعلیم ۳۱، جولائی، جون ۱۹۴۹ء

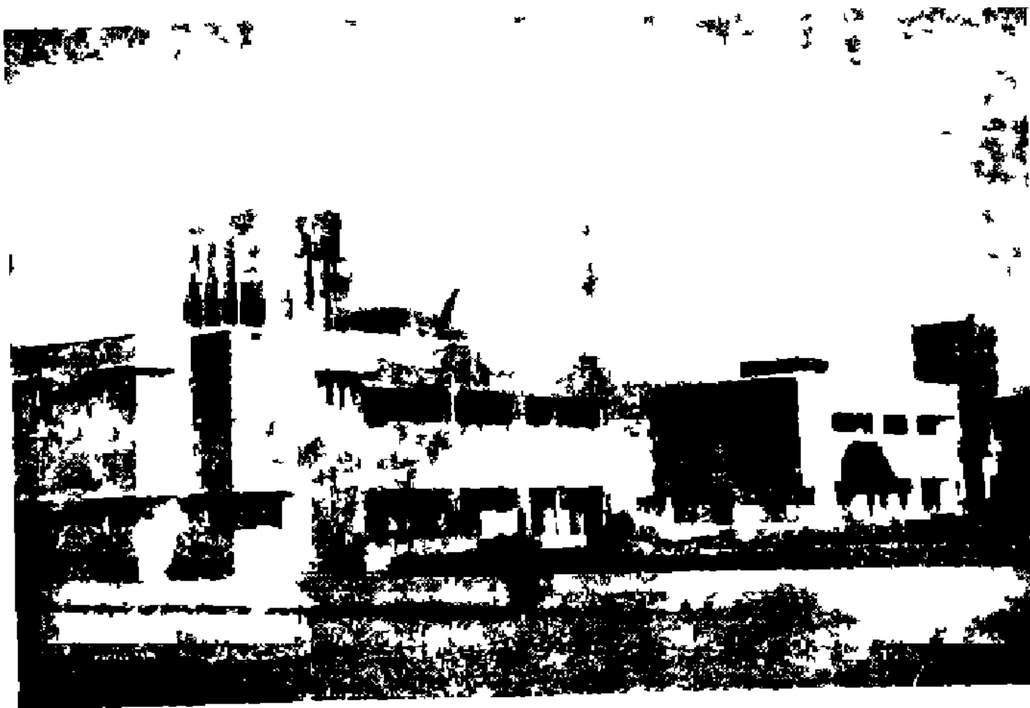
۲۴. آزاد تعلیم کا ایک تجربہ — نئی روشنی، دہلی، ۱ (۱۹) یکم نومبر ۱۹۴۸ء: ۲

— جامعہ ملیہ اسلامیہ جوبلی پر خطبہ

۲۵. تحریک جامعہ سکاؤٹ کے افتتاح کے موقع پر تقریر۔ — ہمدرد جامعہ جنوری ۱۹۴۷ء

۲۶. نئے سال پر پیام — ہمدرد جامعہ ۶ (۵) فروری ۱۹۴۱ء: ۴

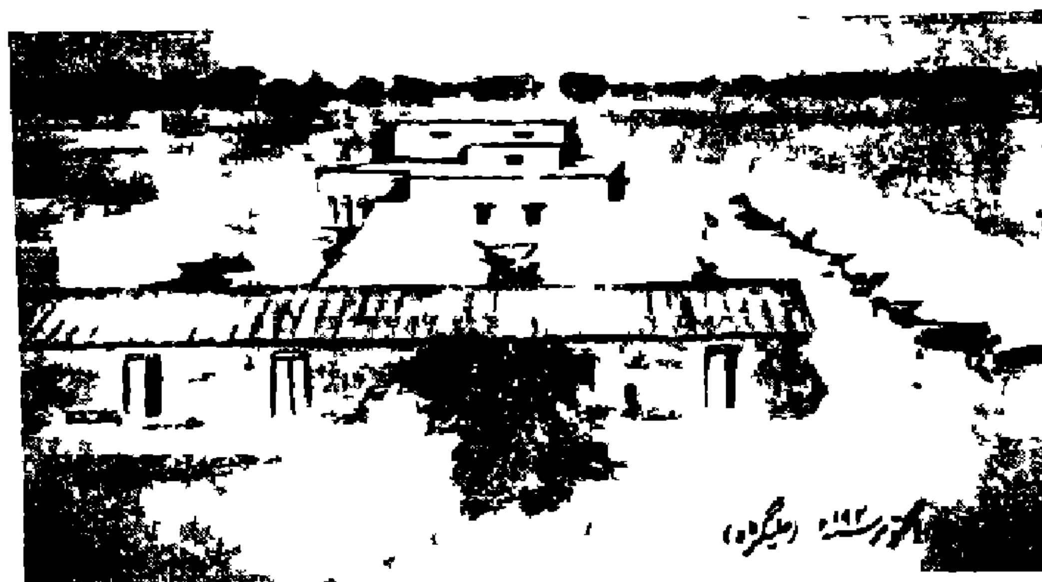
(حالی پرنٹنگ پریس دہلی)



Jamia Schools



Teachers' College



Jamia in 1920

STUDENTS' COUNCIL TEACHERS' COLLEGE



S C Jain, Jai Prakash Neeta Bhandari Prabha Bhandari M Akram Shakeel Ahmad,

Usha Nayar Mam Raj (Sec) Dr Salamatullah, (Principal) Nirmal Makkar (President) Imail Khan (Adviser)

शैक्षणिक परिभ्रमण *[Educational Tour]*

बी एड के ७५ छात्र छात्राओ के समूह ने श्री गुलाम दस्तगीर के नेतृत्व मे १७ से ३१ दिसम्बर सन् ७२ तक अजन्ता एलौरा व बम्बई का भ्रमण रेलगाडी द्वारा किया इस भ्रमण के अन्तगत इन्होने औरंगाबाद, अहमदाबाद, जयपुर और अजमेर आदि नगरो का भी भ्रमण किया। इसी समय बी एड के शेष २५ छात्र छात्राओ न दिल्ली की शैक्षिक सस्थाओ का भ्रमण किया। इस समूह के परामर्शदाता श्रीमती नकवी, श्री इकराम अहमद, श्री यूसूफ, श्री मसरूर हाशमी थे।

इन्ही दिनो डिप्लोमा बेसिक द्वितीय वर्ष के छात्र छात्राओ ने डा० सत्यपाल रुहेला की सरक्षता मे आगरा तथा फतेहपुर सीकरी का शैक्षणिक परिभ्रमण किया इस भ्रमण के अन्तर्गत मथुरा के नाथ स्थानो के दशन भी किये गए। इसी प्रकार डिप्लोमा आट द्वितीय वर्ष के छात्र छात्राओ के एक समूह ने पडित तुला राम गौड की सरक्षता मे उदयपुर, चित्तौड गढ तथा जयपुर का शैक्षणिक परिभ्रमण किया।

सास्कृतिक कार्य क्रमो के साथ ही शारीरिक स्वास्थ्य सम्बन्धी कार्य क्रम भी छात्र सघ की ओर से आयोजित किये जाते रहे। समय समय पर अनेक खेल कूद प्रतियोगितायें आयोजित की गई। दिसम्बर १९७२ मे वाली-बाल टूर्नामैंट मे आजाद सदन ने प्रथम तथा टैगोर सदन ने द्वितीय स्थान प्राप्त किया।

अनमोल–वचन

उर्मिल सपरा

जो व्यक्ति अपने रहस्य को छिपाए रखता है, वह अपनी कुशलता को अपने हाथ मे रखता है।

—"हजरत उमर"

दौडना बेकार है, मुख्य बात तो समय पर पहुचना है।

—"ल फोंत"

मानव बोलने से तथा पशु न बोलने से कष्ट पाते है।

—"तिलक"

खुशमिजाजी एक बहतरीन पोशाक है जिसे हर सोसाइटी मे पहना जा सकता है।

मेरे पास एक ही दीपक है जो मुझे मार्ग दिखाता है और वह है मेरा अनुभव।

मित्रता करने मे धैर्य से काम लो पर मित्रता कर लो तो उसे अचल और दृढ होकर निभाओ।

मुजीब ने टीचर्स कालेज के छात्र छात्राओ को बधाई दी और उन्हे आदर्श अध्यापक के गुण को ग्रहण करने का उपदेश दिया तदुपरान्त कु० निर्मल मक्कर ने छात्र सघ का परिचय दिया । अन्त में माम राज ने सभा, अतिथि तथा आगन्तुको को धन्यवाद दिया ।

२ सितम्बर सन ७२ को कालिज की प्रथम पिकनिक कुतुब मीनार जैसी ऐतिहासिक स्थान पर की गई । जिसमे समस्त अध्यापक वृन्द और छात्र गण उपस्थित थे । यहा प्रत्येक सदन ० ओर से सास्कृतिक कार्य क्रम आयोजित किये गये । टैगोर सदन ने प्रथम स्थान प्राप्त किया अजमल को द्वितीय और नेहरू को तृतीय स्थान मिला कालेज के प्रिंसिपल डा० सलामत उल्लाह ने पुरस्क वितरण किया तथा छात्र-छात्राओ को सहगामी क्रियाओ मे अधिक से अधिक भाग लेने के लि उत्साहित किया ।

आजाद सदन की ओर से २८ सितम्बर ७२ को जामिआ मिल्लिया के स्थानि ५ कवियो को निमत्रित किया गया । इस छोटे से कवि सम्मेलन मे हिन्दी तथा उर्दू मे उच्च ० की कविताए और गजलें पढी गयी । 'पापाजी' की मिनी कविताए और तरुण जी के गीत विशे सराहनीय रहे । इन कवियो द्वारा युगल स्वर मे गाया हुआ होली गीत बहुत पसन्द किया गय

नेहरू सदन की ओर से २३ नवम्बर '७२ को वाद-विवाद प्रतियोगिता का आयोजन गया जिसमे प्रत्येक सदन ने भाग लिया वाद विवाद प्रतियोगिता का विषय था "वेरोजगा दृष्टिकोण से स्त्रियो को घर मे रहकर घर की देखभाल करना आवश्यक है" इस प्रतियोगि बी एड के श्री शारदा राम को प्रथम, शाह शमशुद्दीन उस्मानी तबरेज को द्वितीय, तथा सिह बेसिक प्रथम वर्ष को तृतीय स्थान प्राप्त हुआ ।

अजमल सदन की ओर से ७ दिसम्बर ७२ को कविता और गजल का आयोजन गया जिसमे सभी सदनो को निमत्रित किया गया । व्यक्तिगत रूप से निर्मल मक्कर ने प्रथ प्राप्त किया तथा सजीदा रहमान और वीना रामश्री को क्रमश द्वितीय और तृतीय स्थान

छात्र सघ के सलाहकार श्री मो इस्माइल और सचिव माम राज की सरक्षत सितम्बर ७२ को 'दी लेडी श्री राम कालेज' मे हुई गजल प्रतियोगिता मे टीचर्स कालेज से निर्मल मक्कर और वीना रामश्री ने भाग लिया । जिसमे व्यक्तिगत रूप मे वीना ० तृतीय पुरस्कार प्रदान किया गया ।

छात्र सघ ने सन १९७२ मे आयोजित जर्मनी के ओलम्पिक खेलो की समुचित के विशेष प्रबन्ध किया । ओलम्पिक खेलो के ताजे समाचारो को एकत्र करके विशेष बुने गये । जिसमे विशेष रूप श्री रन कुमार बी एड आर्ट कयूम अली बी एड आर्ट, ह एड और सुमेर चन्द जैन 'मनमाना' बेसिक द्वितीय वर्ष ने सहयोग दिया ।

अक्टूबर मास मे छात्र सघ ने दिल्ली विश्व विद्यालय के सेवा मुक्त चपरासी वर्ग को ध्यान मे रख कर ४० रुपये एकत्र करके दिये और इसी प्रकार जम्मू कश्मीर शिविर को छात्र सघ ने ३० रुपये एकत्र (चन्दा) करके दिये ।

२१ नवम्बर ७२ को गुजरात विद्यापीठ के विद्यार्थी हमारे कालेज को देखने ० डाक्टर सलामत उल्लाह ने टीचर्स कालेज के कार्य क्रमो से उन्हे परिचित कराया इस गुजरात विद्यापीठ द्वारा सास्कृतिक कार्य क्रम का आयोजन भी किया गया ।

छात्र-सघ की रिपोर्ट

माम राज राठौर (सेक्रेट्री)

टीचस कालेज के छात्र सघ का सगठन ७ अगस्त १६७२ को किया गया। टीचस कालेज के छात्र छात्राओ को पाच सदनो मे विभाजित किया जाता है। ये सदन क्रमश अजमल, आजाद, गाधी नेहरू और टैगोर है। प्रत्येक सदन से दो प्रतिनिधियो का चुनाव निर्णायको की उपस्थिति मे निम्न प्रकार मे हुआ।

सदन	निर्णायक	प्रतिनिधि	कक्षा
अजमल	श्री ए यूसूफ	निमल मक्कर	बी एड
		जय प्रकाश शर्मा	बेसिक द्वितीय वर्ष
आजाद	श्री आर पी श्रीवास्तव	मो अकरम फर्शौरी	बी एड
		प्रभा भडारी	बेसिक द्वितीय वर्ष
गाधी	श्री जुनेदुल हक	सुषमा नरुला	बी एड
		माम राज	बेसिक द्वितीय वर्ष
नेहरू	श्री मुईनुद्दीन	नीता भडारी	बी एड
		शकील अहमद	बेसिक द्वितीय वर्ष
टैगार	श्री मसरूर हशमी	ऊषा नायर	बी एड
		सुमेर चन्द जैन 'मनमाना'	बेसिक द्वितीय वर्ष

प्रधान पद के लिए निर्मल मक्कर और सचिव पद के लिए माम राज को चुना गया।

छात्र सघ ने १६ अगस्त सन् ७२ को जामिआ मिल्लिया इस्लामिया के उपकुलपति प्रो० मुर्जीब का टीचस कालेज के हाल मे स्वागत किया। उत्सव का प्रारम्भ कुरान, श्रीमद्भगवत गीता, बाइबिल तथा गुरु ग्रन्थ जैसी पवित्र पुस्तको के भाव विभोचन से किया गया उपकुलपति प्रो०

गई। अपनी घरवाली की धोखाबाजी का उसे बहुत नुकसान उठाना पड़ रहा था। मुकदमे मे जीतने के लिए उसके पास कोई गवाह न था और न ही इतनी रकम थी कि वकील के मुह से सच उगलवा सकें। अन्त म उसकी हार हुई और प्रभा मुकदमा जीत गई। वहा पर अदालत मे प्रभा ने श्याम पर झूठे से झूठे, बुरे-२ आरोप लगाए। गवाह न होने की वजह मे श्याम हार गया। आज रुपए ने उसके मुह पर जबरदस्त तमाचा मारा था। आज पैसे की खातिर उसे अपनी दुनिया उजड़ती दिखाई दी थी। घर गया घर की पूजी गई, स्त्री द्वारा लगाये सरासर झूठे आक्षेपो से उसकी नौकरी गई, और उसकी इज्जत गई। और सबसे प्यारी चीज पहले वाली प्रभा भी गई। मुन्ना उसे नही मिला क्योकि वह छोटा था। कानून की नजर मे वह अभी माँ के पास ही रह सकता है। प्रभा ने उसे बहुत बड़ा धोखा दिया था। उसके ब्यान सुनकर वह भौंचक्का सा रह गया था कि क्या यही वह प्रभा है, जिसने एक दिन मुझे अपना रहने की प्रार्थना की थी। उसके साथ जीवन बिताने की कसमे खाई थी। उसे हमेशा प्रसन्न रखने का प्रयास करती थी। यह सब सोचकर उसका सिर चकरा गया। उसे पृथ्वी घूमती दिखाई दी। उसके दिल पर यह आखिरी आघात था। अब तक वह कोशिश करता रहा कि वह प्रभा को दोबारा पा लेगा। उसे फिर अपनी दुनिया म ले आएगा। लेकिन वह चिल्ला उठा—प्रेम से बढ कर रुपया है! स्त्री एक धोखा है! मैं लुट गया।

और एक कराहट के साथ उसने हमेशा के लिये अपनी आखें मूद ली। सिर्फ बेबसी!

लगा। अब उसका हाथ खर्चे मे खुल गया। पहले ३०० रुपयो मे जिन्दगी मुखी थी लेकिन अब पैसो की तंगी होने लगी। घर मे क्लेश होने लगता लेकिन श्याम कुछ समझ नही पाता था कि ये सब क्यो हो रहा है? इन सबका क्या कारण है? वह प्रभा को खुश रखना चाहता था। इसलिए *Part time* काम भी करने लगा। लेकिन इनके जीवन मे जो दरार पड गई थी इसका भरना मुश्किल था।

श्याम आफिस म होना, और प्रभा अपनी बहिन व जीजा जी के साथ सिनेमा हाल मे, रेस्तरां आदि मे। लेकिन श्याम को इसका बिल्कुल खबर न होनी। क्योकि शाम को प्रभा उसे मुन्ने के साथ खेलती हुई घर मे मिलती मगर प्रभा मे श्याम के प्रति आये परिवतन को वह साफ साफ देख रहा था कि प्रभा अब उतनी प्रसन्न व खिली हुई नही रहती जितनी कि वह पहले थी।

आफिस मे लच का समय हुआ। दोस्तो के साथ श्याम ने खाना खाया। थोडा देर बाद उसका सिर चकराने लगा। शरीर मे बुखार की गर्मी महसूस हुई। उसने छुट्टी के लिय अर्जी लिखी और मेज पर रख कर घर आ गया। घर आने पर दरवाजे पर ताला लटका देखा। उसका माथा ठनका। थोडा देर इधर-उधर टहलता रहा। लेकिन तबियत खराब होने की वजह से उसे लेटने की आवश्यकता महसूस हुई। उसने ताला तोडा और कमरे मे आकर पलग पर बेसुध सो गया।

जब उसकी आखे खुली तो शाम हो चुकी थी। मुन्ना उसके पास सो रहा था। प्रभा चौके म खाना बना रही थी। उसे प्रभा की इस लापरवाही पर बहुत क्रोध आया कि मैं बीमार हू, और मुझे जगाया तक नही, न ही मेरे शीघ्र आने का कारण पूछा। लेकिन फिर भी वह प्रभा से कुछ नही बोला। दूसरे दिन यह जान बूझकर दफ्तर जाने का उपक्रम करने लगा। प्रभा ने कुछ नही कहा। श्याम दफ्तर चला गया। घर से वह दफ्तर का नाम लेकर गया मगर एक-डेढ घण्टे इधर-उधर टहलता रहा। इधर प्रभा घर का काम शीघ्रता से समाप्त करके घर का ताला लगाकर बहिन के घर चली गई। श्याम घर लौटा तो वही ताला दरवाजे पर विराजमान था। उसको पहले ही थोडा शक था लेकिन उसने प्रभा पर प्रकट नही किया था। साईकिल का रुख उसने अपनी साली के घर की तरफ किया। वहा पर प्रभा अपने बहनोई से हस २ कर बतला रही थी। देखते ही श्याम का खून खौल गया। उसने प्रभा को घर चलने के लिय कहा। बहिन और बहनोई के इशारे करने पर वह श्याम के साथ वापिस घर आ गई। अब इन दोनो के बीच मे एक बहुत बडी खाई थी जिसे पाटना कठिन था। रोज क्लेश होना। अपने गम को भुलाने के लिये श्याम ने शराब पीना शुरु कर दिया। और इधर प्रभा का बहिन के घर आना जाना जारी रहा। और तो और अब वह घर का एक-२ सामान धीरे २ बहिन के घर ले जाने लगी। श्याम उसकी षडयन्त्र समझने मे असमर्थ था और एक दिन गुस्से मे आकर श्याम ने प्रभा को खूब पीटा। वह उसी समय बच्चे को साथ लेकर अपनी बहिन के घर आ गई। श्याम का क्रोध जब ठण्डा हुआ तो वह उसे लेने पहुचा तो प्रभा ने कहा—"अब मैं तुम्हारे घर कभी नही जाऊगी।" श्याम ने बहुत कोशिशे की कि प्रभा को वापिस घर ला सके लेकिन वापिस न ला सका। हारकर उसने अपनी साली पर मुकदमा दायर कर दिया। श्याम की रही सही पू जी मुकदमे मे खत्म हो

बेबसी

निरजना कदम (डिप्लोमा बसिक)

श्याम आज बहुत खुश था, आज उसे अपनी बेसहारा जिन्दगी मे एक सहारा मिल गया था। उसकी तैरती हुई नैया ने किनारा पा लिया था। वह ससार मे अकेला था, उसकी दूर की रिश्ते के शायद कोई बहिन थी, लेकिन उसने भी उससे नाता तोड लिया था। मगर आज जैसे उसे ससार मिल गया था। उसकी जिन्दगी म प्रभा क्या आ कि सारा जीवन आलोकित हो उठा।

प्रभा भी श्याम को पाकर बहुत प्रसन्न थी। उसे एक खूबसूरत, नौजवान, शिक्षित पति मिल गया था। श्याम ने उसी रात प्रभा से कहा—प्रभा तुम्हे मुझसे क्या मिल पायेगा ? मैं तो तीन सौ रुपये पाने वाला क्लर्क हू। क्या मै तुम्हे वह खुशिया और रगरेलिया दे सकूगा जो तुम्हारी बहनो को प्राप्त है। प्रभा ने नाराज होते हुए जवाब दिया—"आप ऐसा क्यो कहते मैं इन थोडे रुपयो म ही खुश हू। बस तुम मेरे ही रहना। मुझे इसके सिवा कुछ नही चाहिए श्याम ने उसे अपने आगोश मे भर लिया। उसकी झोली मे वो सब खुशिया डाल दी जो कि चाहती थी। उन दोनो की जिन्दगी बडी हसी-खुशी के साथ गुजर रही थी। श्याम प्रभा हमेशा प्रसन्न रखता। इधर प्रभा भी उसी की पूजा किया करती। दोनो एक दूसरे को चाहते थे। इसी बीच अब उनकी गोद म एक नन्हा भी था। वे नन्हे को पाकर बहुत खुश श्याम शाम को जब आफिस से लौटा करता तो प्रभा दरवाजे पर प्रतीक्षा करती हुई करती। प्रभा एक सुनार की बेटी थी। उसकी तीन बहनें और थी जो कि ऊचे-ऊचे घरा ब्याही गयी थी। उनके ससुराल मे सर्राफ की दुकान थी।

एक दिन प्रभा का जब मन नही लगा तो वह तैयार होकर अपनी मझली बहिन चली गई और शाम को वापिस घर आ गई। इस प्रकार दिन गुजरते रहे।

बीच-बीच मे प्रभा अपनी बहिन के घर चली जाया करती। अपनी बहिन के देख-२ कर उसे ईर्ष्या हुआ करती। लेकिन बडी बहिन उसे बहुत चाहती थी। उसे रुपया काफी मदद भी देती। इधर इन फालतू रुपयो के मिलने से उसके सुखी जीवन मे वि

जला दिया। ऐसा क्यो ? तो उनका उत्तर यही होगा कि डी ग मों का बसें सरकारी है और सरकार से ही हमारा विरोध है। लेकिन वे यह नही सोचते कि जब देश की हानि होती है, तो आर्थिक कठिनाई के कारण सरकार जनता पर कर लगा देती है जिसमे छात्र भी आ जाते हैं। जब सरकार जनता की है, जनता द्वारा बनाई जाती है, तो जिसे आप क्षति पहुचाते है वह भी आपकी हमारी सब की सरकार हैं।

छात्रो को चाहिए कि यदि विद्यालय के वातावरण मे अलग कोई व्यक्ति शिक्षण के विरुद्ध प्रेरित करे तो उसकी मन्त्रणा को भूल कर भी ग्रहण न करे और न ही उसके बताये गए निर्देशो पर अमल करे। जहा तक हो सके वहा तक अपने सम्पर्क मे आने वाले प्रत्यक छात्र को उपर्युक्त कुरीतियो से बचने की सलाह दो। कहने का तात्पर्य यह है कि वक्त अपनी चिरपरिचित चाल से अविराम चला जा रहा है। अत छात्रो को सोचना चाहिये कि उनका अमूल्य समय आदोलन करने मे ही चला जायेगा। छात्रो की जो अवस्था है यही वह समय है जब कि मानव की बुद्धि एक ऐसे दौर से गुजरती है जहा पर वह भटक जाता है यदि इस नाजुक समय के दौरान उनको उचित मार्ग दर्शक नहीं मिलता तो उनकी जिंदगी का वही हाल होगा जो कि आधुनिक छात्र-समाज का है।

जब यही छात्र वर्ग इस दौर से गुजर कर किसी हम सफर के साथ सफर करेगा और अपनी अलग दुनिया आबाद करता तो उस समय यदि वह दम्पति सुख-सागर म डुबकिया लगा रहा है तो निश्चय हो उसने शिक्षण काल म अपनी बुद्धि का सही ढंग से प्रयोग किया होगा। और यदि किसी राही को हम राही न मिलने के साथ-साथ दो जून रोटी का सहारा भी नही मिला है तो निश्चय ही उसके स्मृति-पटल पर शिक्षण काल के उपद्रवो का चित्र अंकित हो जाता होगा, और अतिरिक्त इसके कि वह गुजर हुए जमाने के कारवां की धूल मे से खुशनसीबी के आलम को देखने की असफल कोशिश करे, और कुछ हाथ लग सकता है। अत निराश होने की आवश्यकता बिल्कुल नहीं अभी वक्त है—सम्भल जाओ।

वर्तमान छात्र, जितना कुछ है उससे सन्तुष्ट नहीं रहता, और न ही रहने की कोशिश करता है। वह कभी शान्त नही रह सकता। विद्यालय म भी उसका मन शिक्षण कार्य मे नही लगेगा। क्योकि शिक्षा सस्थाओ म जिन आवश्यकताओ को पूरा किया जाता है वह उनको भुला-कर उसमे त्रुटिया खोजता है। और नाम मात्र आवश्यकता को बढ़ा-चढ़ाकर अन्य छात्रो को भड़का देता है। सोचो, देश की बुनियाद आग आने वाली पीढ़ी पर रखी जाती है। और उसमे भी शिक्षित वर्ग का हाथ अधिक रहता है। और यदि छात्र ही पथ भ्रष्ट हो गए तो इस राष्ट्र के भविष्य-भवन का क्या हाल होगा ?

बेबसी

निरजना कदम (डिप्लोमा बेसिक)

श्याम आज बहुत खुश था, आज उसे अपनी बसहारा जिन्दगी मे एक सहारा मिल गया था। उसकी तैरती हुई नैया न किनारा पा लिया था। वह ससार मे अकेला था, उसकी दूर की रिश्ते के शायद कोई बहिन थी, लेकिन उसने भी इससे नाता तोड लिया था। मगर आज जैसे उसे ससार मिल गया था। उसकी जिन्दगी मे प्रभा क्या आई कि सारा जीवन आलोकित हो उठा।

प्रभा भी श्याम को पाकर बहुत प्रसन्न थी। उसे एकखूबसूरत, नौजवान, शिक्षित पति मिल गया था। श्याम ने उसी रात प्रभा से कहा—प्रभा तुम्हे मुझसे क्या मिल पायेगा ? मै एक तीन सौ रुपय पाने वाला क्लर्क हू। क्या मै तुम्हे वह खुशिया और रगरेलिया दे सकू गा जो कि तुम्हारी बहनो को प्राप्त है। प्रभा ने नाराज होते हुए जवाब दिया—"आप ऐसा क्यो कहते हो, मै इन थोडे रुपयो मे ही खुश हू। बस तुम मेरे ही रहना। मुझे इसके सिवा कुछ नही चाहिए।" श्याम ने उसे अपने आगोश मे भर लिया। उसकी झोली मे वो सब खुशिया डाल दी जो कि वह चाहती थी। उन दोनो की जिन्दगी बडी हसी-खुशी के साथ गुजर रही थी। श्याम प्रभा को हमेशा प्रसन्न रखता। इधर प्रभा भी उसी की पूजा किया करती। दोनो एक दूसरे को खूब चाहते थे। इसी बीच अब उनकी गोद म एक नन्हा भी था। वे नन्हे को पाकर बहुत खुश थे। श्याम शाम को जब आफिस से लौटा करता तो प्रभा दरवाजे पर प्रतीक्षा करती हुई मिला करती। प्रभा एक सुनार की बेटी थी। उसकी तीन बहने और थी जो कि ऊचे-ऊचे घरानो म ब्याही गयी थी। उनके ससुराल मे सर्राफ की दुकाने थी।

एक दिन प्रभा का जब मन नही लगा तो वह तैयार होकर अपनी मझली बहिन के घर चली गई और शाम को वापिस घर आ गई। इस प्रकार दिन गुजरते रहे।

बीच-बीच मे प्रभा अपनी बहिन के घर चली जाया करती। अपनी बहिन के ठाठ-बाट देख-२ कर उसे ईर्ष्या हुआ करती। लेकिन बडी बहिन उसे बहुत चाहती थी। उसे रुपया-पैसो से काफी मदद भी देती। इधर इन फालतू रुपयो के मिलने से उसके सुखी जीवन मे विष घुलने

जला दिया। ऐसा क्यो ? तो उनका उत्तर यही होगा कि डी टी सी की बस सरकारी हैं और सरकार से ही हमारा विरोध है। लेकिन वे यह नही सोचते कि जब देश की हानि होती है, तो आर्थिक कठिनाई के कारण सरकार जनता पर कर लगाती है जिसमे छात्र भी आ जाते हैं। जन सरकार जनता की है जनता द्वारा बनाई जाती है, ना जिसे आप क्षति पहुचाते हैं वह भी आपकी हमारी सब की सरकार है।

छात्रो को चाहिए कि यदि विद्यालय के वातावरण मे अलग कोई व्यक्ति शिक्षण के विरुद्ध प्रेरित करे तो उसकी मन्त्रणा को भूल कर भी ग्रहण न करे और न ही उसके बताये गए निर्देशो पर अमल करे। जहा तक हो सके वहा तक अपने सम्पर्क मे आने वाले प्रत्येक छात्र को उपयुक्त कुरीतियो से बचने की सलाह दे। कहने का तात्पर्य यह है कि वक्त अपनी चिरपरिचित चाल से अविराम चला जा रहा है। अत छात्रो को सोचना चाहिये कि उनका अमूल्य समय आदोलन करने मे ही चला जायेगा। छात्रो की जो छात्रायु है यही वह समय है जब कि मानव की बुद्धि एक ऐसे दौर से गुजरती है जहा पर वह भटक जाता है यदि इस नाजुक समय के दौरान उनको उचित मार्ग दर्शक नही मिलता तो उनकी जिंदगी का वही हाल होगा जो कि आधुनिक छात्र-समाज का है।

जब यही छात्र वर्ग इस वय से गुजर कर किसी हम सफर के साथ सफर करेगा और अपनी अलग दुनिया आबाद करेगा तो उस समय यदि वह दम्पति सुख-सागर मे डुबकिया लगा रहा है तो निश्चय ही उसने शिक्षण काल मे अपनी बुद्धि का सही ढग से प्रयोग किया होगा। और यदि किसी राही को हम राही न मिलने के साथ-साथ दो जून रोटी का सहारा भी नही मिला है तो निश्चय ही उसके स्मृति-पटल पर शिक्षण काल के उपद्रवो का चित्र अकित हो जाता होगा, और अतिरिक्त इसके कि वह गुजरे हुए जमाने के कारवां की धूल मे से खुशनसीबी के आलम को देखने की असफल कोशिश करे, और कुछ हाथ लग सकता है। अत निराशा होने की आवश्यकता बिल्कुल नही अभी वक्त है—सम्भल जाओ।

वर्तमान छात्र, जितना कुछ है उससे सन्तुष्ट नही रहता, और न ही रहने की कोशिश करता है। वह कभी शात नही रह सकता। विद्यालय मे भी उसका मन शिक्षण कार्य मे नही लगेगा। क्योकि शिक्षा सस्थाओ मे जिन आवश्यकताओ को पूरा किया जाता है वह उनको भुला-कर उसमे त्रुटिया खोजता है। और नाम मात्र आवश्यकता को बढा-चढाकर अन्य छात्रो को भडका देता है। सोचो, देश की बुनियाद आगे आने वाली पीढी पर रखी जाती है। और उसमे भी शिक्षित वर्ग का हाथ अधिक रहता है। और यदि छात्र ही पथ भ्रष्ट हो गए तो इस राष्ट्र के भविष्य-भवन का क्या हाल होगा ?

देशो की कूट-दृष्टि भारत की ओर कैसी है ? छात्रो मे असन्तोष की भावना इस कदर घर कर गई है कि वे किसी भी बात वा सन्तुष्टि की दृष्टि से देखते है । छात्र इतना भी नहीं सोच सकते है कि उनके इन उपद्रवो से स्वय सरकार व जनता दोनो परेशान है । और तो और उनके अभिभावक भी परेशान है । कुछ गलत सगठनो ने जहा इनमे कोई चुभती हुई बात कही और वे लगे राष्ट्र को क्षति पहुचाने । जब सरकार इन उपद्रवो से मागो का पूरा नही करती तो कोई और रास्ता अपनाया जाये ।

वास्तव मे दोषी कौन है ? यह प्रश्न विचारणीय है । राष्ट्रपति श्री गिरि ने मद्रास के एक कन्या विद्यालय मे भाषण करते हुये 'पुरुष-शिक्षको, को देश के युवा वर्ग की शिक्षा को बर्बाद करने और उन्हे बुरा परीक्षण देने के लिए दोषी ठहराया है । दूसरी ओर अध्यापक दिवस के लिए सदेश देते हुए उन्होने समाज से शिक्षको को उचित सम्मान देने के लिये कहा है । निश्चय ही उनका अभिप्राय केवल महिला शिक्षको से ही नही होगा बल्कि वह पुरुष शिक्षको को भी उचित सम्मान देने के पक्ष मे होगे । तब उनके इन दोनो कथनो मे क्या सगति है ? लगता है, श्री गिरि, क्योकि 'कन्या विद्यालय' मे भाषण कर रहे थे इसलिए स्थान और अवसर को देख कर उन्होने 'पुरुष-शिक्षको' का दोष विष्करण कर दिया होगा । परन्तु वास्तव मे दोषी कौन है ?

ऊपर लिखी बातो मे यह आशय बिल्कुल नही है कि सारा दोष बुनियादी शिक्षा के विषय मे सरकार का ही है और सरकार ही देश की बुनियाद को कमजोर बना रही है । दूसरा पहलू इसका यह भी है कि अध्यापको व अध्यापिकाओ का भी अपने कर्त्तव्यो के प्रति दृढ रहना आवश्यक है, अन्यथा सरकार अकेली क्या कर सकती है यह गाडी तो सहयोग से ही चल सकती है । मान लीजिये किसी इलाके मे एक प्राइमरी स्कूल है । वहा केवल एक शिक्षक है और उस शिक्षक के घर भी कोई निजी कार्य है जैसे—घर पर दूकान का होना आदि । यदि शिक्षक का घर स्कूल के समीप है तो वह स्कूल की अपेक्षा अधिक समय अपने दूकान पर ही व्यतीत करेगा । जब कि वेतन शिक्षक को सतोषप्रद मिलता है तो आप अनुमान लगा सकते है कि उसकी अनुपस्थिति मे बच्चो का माहौल क्या होता होगा । बच्चे, जिनसे देश की उन्नति की आशाए बधी हुई है उनका स्वय का भविष्य क्या होगा ? शिक्षक एक कुम्भकार है, और बच्चे (छात्र) उसके बर्तन है, और स्कूल व कक्षा का माहौल आवा है । कुम्भकार चाहे जैसा उन्हे पका सकता है ।

इस देश मे वही शिक्षा पद्धति सोद्देश्य सफल हो सकती है जिसकी जड़ें भारतीय सस्कृति मे हो, राष्ट्रीय एकता, देश के प्रति अनन्य निष्ठा तथा आत्म निर्भरता के पथ पर भारत के नवयुवक तभी द्रुत गति से आगे बढेगे जब कि वे भारतीय साहित्य, कला तथा सस्कृति से भली-भाति परिचित हो और इनके प्रति प्रगाढ अनुराग हो ।

वर्तमान स्थिति का ध्यान मे रखते हुए युवा छात्र वर्ग को भी चाहिए कि वह भी कोई ऐसी गलती न करे जिससे देश का अनिष्ट हो । मान लीजिये छात्रो ने अपना आक्रोश राष्ट्र की पूजी को जलाकर, तोड कर तथा नष्ट करके प्रकट किया, और सरकार को यह बताया कि यदि उनकी मागे पूरी न की गई तो वे राष्ट्र-कृतियो को नष्ट कर देंगे । बसे जलाने पर छात्रो से पूछा जाये कि उन्होने उन बसो को तो छोड दिया जो निजी कहलाती है और डी टी सी की बसो को

बुनियाद

ग्गासरन सिह, (बी एड)

'गर किसी मका की, बुनियाद ही कमजोर है।
तो गिरने की उस मका की, उम्मीद भी पुरजोर है।।

बुनियाद से मेरा तात्पय इतना है कि जिस भावी भवन के आधार स्तम्भ जिस सुदृढ आधार पर रख जाते है, वह उस मका की बुनियाद है। जिस पर उस भवन का भविष्य निभर है। आप किसी भी क्षेत्र मे चले जाइए—राजनीतिक, सामाजिक, आर्थिक आदि, यदि इनमे से किसी की बुनियाद व्यथ व अनुभवो पर आधारित है तो आप समझिए कि वह राष्ट्र भी उन्नति के पथ से भटक जाएगा। किसी देश के जीवन-यापन के लिए उपयुक्त नीतियो की आवश्यकता जहा तक आवश्यक है, वही पर किसी सीमा तक शिक्षा का योगदान भी कम नही है यदि हमारी शिक्षा की बुनियाद (जो बुनियादी शिक्षा मे निहित है) कमजोर है तो हम भविष्य म कभी भावी आशाओ को पूण नही कर सकते।

शिक्षा, जो दो पहियो की गाडी है, उसका एक पहिया छात्र है और दूसरा अध्यापक वर्ग एव चालक सरकार है, यदि दोनो पहियो मे से एक भी गलत चले तो चालक कितना ही भी खीचे गाडी आगे को चल नही सकती। ऐसे अनेक कारण है जो छात्रो को भडकाते है तथा उनको उपद्रव करने के लिए प्रेरणा देते हे। यदि छात्र एक दूसरे का अनुसरण उद्दण्डता पूण कार्यो मे करना छोड दे ता समस्या का रूप विकराल नही रह सकता।

वर्तमान स्थिति मे जो हमारे नेता तथा देश के कणधार है, वे चाहे कैसे भी है परन्तु वे युवा अवस्था म वतमान छात्रो की तरह नही रहे होगे। अब चिता का विषय यह है कि यह पार्थिव जीवन नश्वर है, और प्रौढो की जिन्दगी कब तक साथ देगी। अत वतमान युवा पीढी को अपनी प्रौढावस्था मे राज्य की बागडोर सम्भालनी है। मुझे तो लगता है कि इस समय का युवक भविष्य मे प्रकृति की ओर से तो प्रौढ हो जाएगा, लेकिन शायद मन न बदले। यदि मन न बदले तो सर्व सत्यानाश। छात्रो को स्वय सोचना चाहिए कि जिस देश मे इतनी गरीबी है और उस देश की वे बुनियाद है। जब बुनियाद कमजोर है तो देश का भविष्य उज्ज्वल कैसे होगा? अन्य

है, अविवेकी पुजारियो का देश है, भाई-भाई मे नफरत का देश है, बीमारियो का देश है, सस्ती मौत का देश है, गरीबी और अधेरे का देश है, भूख और मुसीबत का देश है, यानि बडा कम्बख्त देश है। लेकिन क्या कीजिये। तुम्हारा और हमारा देश है। इस मे जीना है और इसी मे मरना है। इसलिये यह देश तुम्हारी हिम्मत के इम्तिहान, तुम्हारी शक्तियो के प्रयोग और तुम्हारे प्रेम की परख की जगह है।

अपने चारो तरफ इतनी बर्बादी, इतनी मुसीबत, इतना जुल्म देखकर तुम अधीर होकर यह चाहो, जैसे बहुत से नौजवान चाहने लगते है कि इसमे बसने वाले समाज ही को खत्म कर डालें और मिटा डालें, इसलिये कि इसमे सुधार की कोई सूरत नही। तुम्हे अधिकार है। मगर अपने एक भाई की राय सुन लेने मे भी क्या नुकसान है। तो, मेरा विचार यह है कि बर्बाद करने से हमारा काम कुछ सहल नही होगा, बरबादी तो पहले ही से काफी मौजूद है। राष्ट्रीय जीवन का ऐसा कौन सा विभाग है, जिस पर पहले से ही विपत्ति या विनाश की गहरी छाया नही। लेकिन हमारी अनेक बीमारियो और अनगनित मुसीबतो मे से ऐसी बहुत कम है कि हम एका-एक आवेश मे आकर थोडी सी देर में उन्हे खत्म कर डाले। मैं समझता हू, कि हम बिगाडना इतना नही है। जितना कि बनाना है। हमारे देश को हमारी गर्दनो से उबलते खून के धार की जरूरत नही है, बल्कि हमारे माथे के पसीने का बारहमासो बहने वाला दरिया दरकार है। जरूरत है काम का—खामोश और सच्चे काम की। हमारा भविष्य किसान की टूटी झोपडी कारीगर की धुए से काली छत और देहाती मदरसे के फूस के छप्पर तले, बन और बिगड सकता है। राजनीतिक झगडो, कान्फ्रेंसो और काग्रेसो मे कल और परसो के किस्सो का फैसला हो सकता है। लेकिन जिन जगहो का नाम मैंने लिया है उनमे सदियो तक के लिये हमारी किस्मत का फैसला होगा, और इन जगहो का काम धीरज चाहता है और सयम। इसमे थकान भी ज्यादा है और कदर भी कम होती है, जल्दी नतीजा भी नही निकलता। हां कोई देर तक धीरज रख सके तो जरूर फल मीठा मिलता है।

कान्वोकेशन एड्रेस
काशी विद्यापीठ १९५३

भी हाथ आए। कोई कहता है हरकत में बरकत है - बच्चों को जरा हाथ-पैर चलाने का मौका दो, चाहे कुछ बने या न बने—यह कोई मजदूरो का काम थोडे ही है, यह तो एक रचनात्मक (तखलीकी) काम है मैं उन लोगो मे से किसी से झगड़ा मोल नही लेता, केवल अपना मत प्रकट करना चाहता हूँ। मेरा विचार है कि जब हम शिक्षा के सम्बन्ध मे काम की चर्चा करे, तो हमें वही काम ध्यान मे रखना चाहिये, जिससे शिक्षा मिले, मस्तिष्क का विकास हो आदमी अच्छा आदमी बने। मैं समझता हूँ कि आदमी का मस्तिष्क अपने किए को परखकर और उसके अच्छे-बुरे पर नजर करके तरक्की करता है। और आदमी जब कुछ बनता है, या कोई काम करता है—चाहे यह काम हाथ का हो चाहे दिमाग का—तो इसकाम मे मानसिक शिक्षा का लाभ तभी पहुँच सकता है, जब वह इस काम को पूरा करने के लिए अपना कर्त्तव्य भी पूरा करे, यानि इस काम के लिये अपनत्व का कुछ त्याग करे, अपने ऊपर नियन्त्रण करे। काम से शिक्षा सबधी लाभ वही उठाता है, जो इसके लिये अपना कर्त्तव्य पूरा करने मे इसके अनुशासन को भी अपने पर पूरी तरह लागू कर ले। इसलिये हर काम शिक्षा का काम नही होता। काम का सबन्ध शिक्षा से तब ही हो सकता है, जब कि इसके शुरू मे मस्तिष्क कुछ तैयारी करे। जिस काम मे मस्तिष्क का योग न हो, वह काम तो मुर्दा मशीन भी कर सकती है और इससे मस्तिष्क का विकास नही होता। काम से पहले काम का नक्शा, काम की रूप-रेखा मस्तिष्क मे बनाना जरूरी है। फिर दूसरा कदम भी मस्तिष्क से सबन्ध रखता है यानि इस रूप रेखा को कार्यान्वित करने के साधन सोजना, उनमे से किसी का लेना, किसी को छोड देना। तीसरा कदम होना है, काम को चुने हुए साधनो से कर डालना। और चौथा कदम है, किये हुए को परखना कि जो नक्शा बनाया था, जो करना चाहता था वही किया, और जिस तरह करने का इरादा किया था, उसी तरह किया या नही, और नतीजा इतना ठीक है या नही कि उसे आगे तक किया जाता। ये चार मजिलें न हो, तो शिक्षा का काम हो ही न सकेगा। लेकिन अगर ये चारो हो, तब भी हर काम शिक्षा का काम नही हो जाता। हर ऐसे काम से कुछ हुनरमन्दी जरूर पैदा हो जाती है, चाहे हाथो की हुनरमन्दी, चाहे मस्तिष्क की, चाहे जबान की। लेकिन हुनरमन्दी शिक्षा नही है। शिक्षित आदमी का जो चित्र हम सबके सामने आता है, उसमे खाली हुनरमन्दी का रंग नही होता। हुनरमद तो चोर भी होते है, हुनरमद धोखे भी देते हैं, हुनरमद सच को झूठ कर दिखाते है। ऐसी हुनरमदी तो शिक्षा का लक्ष्य नही हो सकती। शिक्षा का काम वही काम हो सकता है, जो किसी ऐसी मान्यता की सेवा करे, जो अपनी ही स्वार्थ-भावना से परे हो, और जिसे हम मानते हो। जो अपने ही स्वार्थ के लिये काम करता है वह हुनरमन्द तो जरूर हो जाता है। मगर शिक्षित नही होता। जो मान्यता की सेवा करता वह शिक्षित हो जाता है।

खामोश और सच्चा काम

तुम जिस देश मे यहा से निकलकर जा रहे हो, वह बडा अभागा देश है, वह गुलामो का देश है, अनपढ़ो का देश है, अन्याय का देश है कठोरताओ का देश है, क्रूर परम्पराओ का देश

प्रबन्ध करे, इसलिए कि केवल किताबो मे लिखे रहने से हमारा इतिहास जीवित नही रह सकता इसको जीवित रखने का बस एक उपाय है कि यह समाज के हरेक व्यक्ति के दिल और दिमाग के रेशे-रेशे मे जीवित हो।

हिन्दुस्तानी मुसलमान

सच्चे हिन्दुस्तानी मुसलमान अपनी धार्मिक परम्पराओ, अपने इतिहास, अपनी सास्कृति सेवाओ और अपनी सस्कृति से, अपनी आशाओ के कारण अपने राष्ट्रीय अस्तित्व व अपने लिये भी अमूल्य नही समझते, बल्कि हिन्दुस्तानी राष्ट्र के लिए भी अमूल समझते है, और उसके मिटाये जाने या कमजोर किय जाने को अपने प्रति अत्याचार नही समझते, बल्कि वे हिन्दुस्तानी राष्ट्र के साथ भी बडी घनिष्ठता का अनुभव करते हिन्दुस्तानी मुसलमानो को अपना देश किसी से कम प्यारा नही है। वे हिन्दुस्तानी राष्ट्र एक अग होने पर गर्व करते है, मगर वे एसा अग बनना कभी सहन न करेंगे, जिसमे उनकी अपनी स्थिति बिल्कुल मिट चुकी हो। उनका हौसला है, कि अच्छे मुसलमान हो और अच्छे हिन्दुस्तानी, और न कोई मुसलमान इन्हे हिन्दुस्तानी होने पर शरमाये, न कोई हिन्दुस्तानी उन मुसलमान होने पर उगली उठाये। हिन्दुस्तान मे इनका धर्म देश से उनके सम्बन्ध-विच्छेद कारण न हो, बल्कि वह सेवा का दायित्व इन पर डाले, उनके लिये पातक न बने, बल्कि प्रतिष्ठा। इस धारणा का नतीजा यह होगा कि जब मुसलमान राजनीति के मैदान में दूस तमाम हिन्दुस्तानी जनता के बिल्कुल साथ-साथ होगे पृथक और सयुक्त निर्वाचन के झगडे-ट भी भुलाये जा चुके होगे, और सम्भवत नौकरिया प्राप्त करने में भी मुसलमान एक स्वाभिमा समुदाय की भाति सुरक्षित पदो पर ही पहुचने की अपेक्षा प्रतियोगिता के लिए ही आग्रह क होगे—उस समय भी वे यह जरूर चाहेगे कि उनकी शिक्षा-प्रणाली मे सास्कृतिक वस्तुओ के ि पूर्ण स्थान हो। और मुझे विश्वास है, कि हिन्दुस्तान की विवेकपूर्ण भावी सरकार मुसलमा की इस माग को पूरा करके उनकी उन्नति और उनकी उन्नति से अपनी ही मजबूती का साम करेगी।

शिक्षा और काम

काम को शिक्षा में स्थान देने की चर्चा, आज से नही, बहुत दिनो से चल रही है। म जितने मुह उतनी बातें। कोई कहता है। काम को सिद्धान्त के रूप म मानो, उसे एक विष (मजमून) मत बनाओ। कोई कहता है, उसे एक विषय बना दो, इसके लिए एक घण्टा अल दे दो, मगर और सब काम ज्यो का त्यो रहने दो। कोई कहता है, काम ऐसा हो कि कुछ दा

ज़ाकिर साहब ने कहा

संग्रहनाकार उर्मिल सपरा (बी० एड०)

राष्ट्रीय शिक्षा

"जिस तरह कुछ समय बाद शरीर का एक-एक कण बदल जाता है, मगर उसमें जीवन बराबर बना रहता है जिस तरह पेड़ों की पत्तियां बदल जाती हैं मगर पेड़ वही रहता है—उसी तरह समाज के अनेक व्यक्ति भी—अंग भी, बराबर क्षीण होते रहते हैं, मगर समाज का जीवन बाकी रहता है। हर चेतन पदार्थ की भांति समाज में दो काम बराबर होते रहते हैं—एक तो बदलते रहने का और दूसरा अपनी स्थिति में बने रहने का। इनमें से कोई काम भी रुक जाये, तो मौत का सामना होता है। जो जिस्म या पदार्थ अपने को कायम नहीं रख सकता, वह तो खत्म होता ही है, पर जिसमें अपने को बदलते रहने की शक्ति न रहे, वह भी मौत के घाट उतरता है। समाज में व्यक्तियों के अस्तित्व का उद्देश्य बस यह है कि वे इस उत्पत्ति-विनाश, आत्मरक्षा और परिवर्तन, स्थिति और प्रमाण का साधन बनें। और उन्हें इस योग्य बनाने के लिए समाज का प्रयत्न और उसका कर्त्तव्य नई पीढ़ियों की शिक्षा है। शिक्षा वास्तव में किसी समाज की जानी-बूझी, सोची-समझी कोशिश का नाम है, जो वह इसीलिए करता है कि उसका अस्तित्व बाकी रह सके और उसके व्यक्तियों में इतनी सामर्थ्य उत्पन्न हो कि वे बदली हुई परिस्थितियों के साथ समाज के जीवन में भी उचित और आवश्यक परिवर्तन कर सकें। राष्ट्रीय जीवन में शिक्षा इसी प्रकार अतीत से वर्तमान को जोड़ देती है, जैसे एक आदमी के जीवन में उसकी स्मरणशक्ति। जो समाज अपनी शिक्षा का प्रबन्ध ठीक नहीं रखता वह अपने अस्तित्व को खतरे में डालता है, और जिस तरह स्मरण-शक्ति के नष्ट हो जाने से व्यक्ति के जीवन का सिलसिला बाकी नहीं रहता। उसी तरह राष्ट्रीय शिक्षा होने से राष्ट्रीय जीवन का सिलसिला खत्म हो जाता है। अगर विश्व-समाज में भारतीय समाज को अपनी अलग स्थिति सुरक्षित रखना है, और दूसरे समाजों की अपेक्षा उसके पास कुछ है, जो उसे दूसरों से अलग करता है और वह इतना सशक्त है कि बाकी रहे और विश्वभर का जीवन उससे समृद्ध हो, तो हमारे समाज का कर्त्तव्य है कि अपनी शिक्षा में उन खास चीजों का ध्यान रखे, जिन्हें वह खास अपना समझता है। या अपने अतीत को अपनी आने वाली पीढ़ियों तक पहुंचाने का

बोर्ड का मेम्बर चुना और इस सम्बन्ध मे उन्हे यूरोप जाना पडा। इस जमाने में वो इलाज के लिये जर्मनी गये हुए थे कि प्रधान मंत्री जवाहरलाल नेहरू का सन्देश मिला कि वह बिहार की गवर्नरी के लिये उनका नाम दे रहे हैं, कृपा इन्कार न करे।

१९५७ --जुलाई मे बिहार के गवर्नर नियुक्त हुए।

१९५८ —१२, १३ १४ दिसम्बर को 'पटेल मेमोरियल लक्चर्स' के सम्बन्ध मे *Educational Reconstruction in India* के नाम से अंग्रेजी मे लक्चर दिये जो सितम्बर १९५९ मे एक पुस्तक के रूप मे प्रकाशित हुए। इसका उर्दू अनुवाद डा० सैयद आबिद हुसैन ने किया जो मई १९६२ म प्रकाशित हुआ।

१९६२ —मई मे उपराष्ट्रपति नियुक्त हुए। इसी वर्ष देश की सबसे बडी उपाधि 'भारत रत्न' से विभूषित किये गये।

१९६३ —जाकिर साहब की लिखी हुई विभिन्न कहानियो का सग्रह "अब्बू खां की बकरी और १४ और कहानिया" के नाम से प्रकाशित हुआ।

१९६४ —राष्ट्रपति डा० राधाकृष्णन की आख का आप्रेशन हुआ था, इसलिए उनकी जगह पर राष्ट्रपति के कार्यभार को सभाला। उन्ही दिनो ससद को सम्बोधित किया।

१९६५ —२१ फरवरी को 'दारुल-मुसन्नफान' (शिबली एकाडमी) आजमगढ की गोल्डन जुबली हुई। जाकिर साहब ने इसकी अध्यक्षता की और सरकार की ओर से ५०,००० रुपयो की सहायता की घोषणा की।—राष्ट्रपति डा० राधाकृष्णन लन्दन गये और जाकिर साहब ने राष्ट्रपति की हैसियत से १९ मार्च को शपथ ग्रहण की।

जाकिर साहब ने शिक्षा-सम्बन्धी जो लेक्चर अंग्रेजी मे दिये थे उनका एक सग्रह *'The Dynamic University'* के नाम से प्रकाशित हुआ।

१९६७ —२९ अप्रैल को अमरीका की मिशीगन यूनिवर्सिटी मे *Dr of Laws* की इजाजी डिग्री दी। यह एक ऐसा सम्मान था जिस पर जितना भी गर्व किया जाये कम है। वहा से हिन्दुस्तान वापस आये तो देश मे राष्ट्रपति के चुनाव की चहल पहल थी। जाकिर साहब चुनाव से केवल दिन तीन पहले वापस आये थे यानि जब यहा चुनाव सम्बन्धी जोड-तोड हो रहे थे तो जाकिर साहब हिन्दुस्तान से बाहर थे। ९ मई को चुनाव के परिणाम की घोषणा हुई। जाकिर साहब बहुत भारी बहुमत से सफल हुए थे।

१९६९ —३ मई को अचानक दिल का दौरा पडा। दिन को ११ बजकर २० मिनट पर उनका देहान्त हो गया। ५ मई को शाम के लगभग ८ बजे 'जामिया मिल्लिया इस्लामिया' मे जिसकी स्थापना और उन्नति मे उन्होने अपना खून-पसीना लगाया था, पूरे फौजी सम्मान के साथ अन्तिम सस्कार हुआ।

इसी वर्ष ५, ६, ७ मार्च को हिन्दुस्तानी अकाडमी यू० पी० (इलाहाबाद) के निमन्त्रण पर एक लेख पढ़ा जो "मासिअ्रात—मकसद और मिनहाज" के नाम से प्रकाशित हुआ।

१९३७ —गांधी जी ने वर्धा में एक तालीमी कान्फ्रेंस बुलाई। शिक्षा की योजना और पाठ्यक्रम तैयार करने के लिए जो कमेटी बनाई गई, ज़ाकिर साहब उसके अध्यक्ष बनाये गये।

१९४३ —ज़ाकिर साहब के शिक्षा सम्बन्धी लक्चर और रेडियो के भाषण इस वर्ष "तालीमी खुतबात" के नाम से प्रकाशित हुए।

१९४४ — दिल्ली यूनिवर्सिटी के उपकुलपति "मोरिस गायर" के निमन्त्रण पर 'कैपिटलिज्म' के विषय पर दस लेक्चर दिये जो बाद में एक पुस्तक के रूप में प्रकाशित हुए।

१९४६ —प्रसिद्ध जर्मन लेखक 'फ्रेडरिश लिस्ट' की एक पुस्तक का ज़ाकिर साहब ने बहुत पहले अनुवाद किया था जो उस समय प्रकाशित नहीं हो सका था, जो इस वर्ष अप्रैल में "मासिअ्रात-ए-कौमी" के नाम से प्रकाशित हुआ।

१९४८ —मौलाना आजाद के आग्रह पर मुस्लिम यूनिवर्सिटी अलीगढ़ की वाइस चांसलरी की जिम्मेदारियां स्वीकार कीं। २८ नवम्बर को कोर्ट की मीटिंग में नवाब इस्माइल खां (वाइस चांसलर) ने ज़ाकिर साहब के नाम का प्रस्ताव रखा जो सर्वसम्मति से स्वीकार कर लिया गया।

१९५१ —यू० पी० के शिक्षा मन्त्री की सेवा में केवल लखनऊ के दस हज़ार नागरिकों के हस्ताक्षरों से एक प्रार्थना पत्र दिया जिसमें मांग की गई थी कि उनके बच्चों के लिये उनकी मातृ भाषा उर्दू में शिक्षा का प्रबन्ध किया जाय।—२६ नवम्बर को ६ वर्ष के लिए दुबारा उपकुलपति नियुक्त हुए।

१९५२ —जुलाई में जब वह अमरीका के दौरे पर थे, राज्यसभा के मेम्बर नियुक्त किये गये। ११ अगस्त को शपथ ग्रहण की।

१९५४ —'अन्जुमन तरक्की-ए-उर्दू' के अध्यक्ष की हैसियत से राष्ट्रपति की सेवा में उत्तर प्रदेश के दो लाख बीस नागरिकों के हस्ताक्षरों से एक मेमोरेन्डम दिया जिसमें मांग की गई थी कि उर्दू को दूसरी प्रादेशिक भाषा के रूप में मंजूर किया जाये।—इसी वर्ष पदम्विभूषण की उपाधि मिली।—१५ दिसम्बर को यूनेस्को की ओर से अरब देशों में बुनियादी शिक्षा को परिचित कराने के लिए काहिरा गये।

१९५६ —राज्यसभा के दुबारा मेम्बर नियुक्त किये गये २७ अप्रैल को शपथ ग्रहण की।

इसी वर्ष मई में 'शाह-इब्ने-सऊद' के निमन्त्रण पर सऊदी अरब का १५ दिन का दौरा किया।

मुस्लिम यूनिवर्सिटी की वाइस चांसलरी का समय समाप्त होने में अभी कोई सवा साल बाकी था कि त्याग-पत्र दे दिया जो बड़ी कठिनता से १५ सितम्बर से मंजूर हुआ। अलीगढ़ छोड़ने के बाद जामियानगर वापस आये। आशा थी कि अब कुछ दिन सुख-चैन से बीतेंगे लेकिन यहां आते ही मौलाना आज़ाद ने यूनेस्को की एक मीटिंग के लिये जो इसी वर्ष दिल्ली में होने वाली थी, सरकार का प्रतिनिधि बना दिया। इस मीटिंग में यूनेस्को ने इन्हें अपने एक्जीक्यूटिव

डा० जाकिर हुसैन–महत्वपूर्ण तिथियाँ

अब्दुल लतीफ आज़मी

१८९७— जाकिर साहब हैदराबाद मे पैदा हुए। सही तिथि और मास मालूम नही। अनुमान है कि ८ फरवरी को जन्म हुआ।

१९०७ —इटावा (यू० पी०) के इस्लामिया हाई स्कूल म प्रवेश लिया।

१९१३ —इस्लामिया हाई स्कूल इटावा मे मैट्रिक की परीक्षा पास की, और एम० ए० ओ० कॉलिज अलीगढ म इन्टरमिडियेट (विज्ञान) मे प्रवेश लिया।

१९१५ —क्रिश्चियन कॉलज लखनऊ बी० एस० सी० मे प्रवेश लिया, लकिन बीमारी के कारण परीक्षा मे नही बैठ सके और अलीगढ वापिस आ गये।

१९१८ —एम० ए० ओ० कॉलिज अलीगढ से बी० ए० की परीक्षा पास की।

१९१९ —अलीगढ मुस्लिम यूनिवर्सिटी स अर्थशास्त्र मे एम० ए० प्रथम वष पास किया।

१९२० —असहयोग आन्दोलन के समय २९ अक्तूबर का जामिया मिलिया इस्लामिया की स्थापना हुई। इसकी स्थापना मे जाकिर साहब आगे-आगे थे।

१९२२ —बी० ए० करने के बाद प्रोफेसर एडविन केनिन की पुस्तक "एलिमन्ट्री पोलिटिकल इकोनोमी" का अनुवाद किया था। इस वष यह उर्दू अनुवाद प्रकाशित हुआ इसी वष जाकिर साहब उच्चशिक्षा के लिए बर्लिन (जमनी) गय।

१९२५ —बर्लिन यूनिवर्सिटी से पी० एच० डी० की डिग्री प्राप्त की। इनका थीसिज का विषय था दी सिस्टम आफ एग्रीकल्चरल इकानोमी।

१९२६ —जमनी से वापिस आय और जामिया म अपना कार्य करना आरम्भ किया। अपने साथ डा० सैयद आबिद हुसैन साहब और प्रो० मुहम्मद मुजीब साहब को भी लाये। आते ही आपको उपकुलपति का उत्तरदायित्व दिया गया।

१९३२ —अरस्तु की प्रसिद्ध पुस्तक 'स्टेट" का अनुवाद जाकिर साहब ने उस समय किया जब वह एम० ए० मे पढ रहे थ। यह अनुवाद "रियासत" के नाम से इस वर्ष प्रकाशित हुआ।

यह बचपना नहीं होता वह बच्चों के मन की बातों को न समझ सकता है, न ही समझा सकता है। नादानी से जिस ओर कदम उठाता है, तो कुछ न कुछ कुचल डालता है।

डा० जाकिर साहब ने अध्यापक की पहली पहचान बताई, कि अच्छे अध्यापक को बच्चों और नवयुवकों से स्वाभाविक लगाव और ममता हो इसके साथ-साथ उसमें स्नेह के इस सामंजस्य को एक विशेष रूप से कार्यान्वित करने की क्षमता भी होनी चाहिए। यह क्षमताएं अभ्यास और परिश्रम से बढ़ सकती है मगर होती है यह भी प्राकृतिक और ईश्वर प्रदत्त। कोई ऐसी प्राकृतिक और आंतरिक शक्ति होती है, जो उन्हें नन्हे-नन्हे झरोखों से झांककर आत्मा के छिपे हुए तथ्यों को देख और समझ लेती है। इस प्रकार एक अच्छे अध्यापक की दूसरी विशेषता है कि उसमें आंतरिक शक्ति हो और अनुभूति का सजग चैतन्य भी। मगर समझ लेना और जान लेना भी काफी नहीं। समझकर, जानकर ठीक प्रकार से प्रभावित करने की क्षमता भी होनी चाहिए। उदाहरण के तौर पर एक डाक्टर ऐसा है जो रोग का निदान तो जानता है लेकिन इलाज नहीं कर सकता। इस डाक्टर के प्रकार का अध्यापक भी अच्छा नहीं माना जा सकता। अच्छे अध्यापक को हर परिस्थिति का सामना सूझ-बूझ से करना चाहिये। उसे अपना काम करवाने के लिए कभी हंस कर, कभी नाराज़ होकर, कभी तारीफ करके कभी लज्जित करके बालकों से व्यवहार करना चाहिए अर्थात् एक अच्छे अध्यापक में अपना काम करवाने के लिए हरेक प्रकार की चतुरता विद्यमान हो। अच्छे अध्यापक को उन सभी सांचों से परिचित होना चाहिए जिसमें आदमी का शील ढलता है क्योंकि इन्हीं जानकारियों के आधार पर वह ठीक नतीजे पर पहुंच सकता है। अध्यापक में ठीक प्रकार से अध्ययन करने की भी विशेषता होनी चाहिये। जो अध्यापक थाली के बैंगन की तरह इधर-उधर लुढ़कते हैं वे बच्चों में शील का निर्माण नहीं कर सकते हैं बल्कि एक अच्छे अध्यापक को स्थिर व एकाग्र बुद्धि वाला होना चाहिए तभी वह बालकों को अपने जैसा एकाग्र बना सकता है। एक अच्छे अध्यापक के जीवन की जड़ें स्नेह और अजस्र धारा से अभिसिंचित होना चाहिए।



अच्छा अध्यापक वहां आशा रखता है जहां दूसरे दिल छोड़ देते हैं वहां ताज़ा दम रहता है जहां दूसरे थक जाते हैं इसे वहां प्रकाश दिखाई देता है जहां दूसरे अन्धेरे की शिकायत करते हैं।"

—डा० जाकिर हुसैन

ज़ाकिर साहब की दृष्टि में अच्छा अध्यापक

वीना रानी (डिप्लोमा)

मनुष्य-जीवन किसी न किसी रूप मे किसी दूसरे जीवन से सम्बन्धित होता है। मानसिक जीवन का प्रदीप किसी दूसरे मानसिक जीवन से प्रकाश पाता है। इस प्रकार हरेक मनुष्य किसी दूसरे का अध्यापक, सिखाने वाला, बनाने वाला होता है। लेकिन कई अध्यापक अपने कार्य को अच्छी प्रकार पूरा करते है और कई बेगार टालते हैं। जो इन्सान किसी को कुछ सिखाना चाहे तो पहले स्वय उसे सीखना चाहिए। ऐसे आदमियो के मानसिक रूप मे दो बातें, हमदर्दी और दूसरो से मेल-मिलाप की इच्छा पहले दिन से ही विद्यमान होनी चाहिये। सामाजिक व्यक्ति ही एक अच्छे अध्यापक की श्रेणी मे आ सकता है। सामाजिक व्यक्ति होना, दूसरे आदमियो की जिन्दगियो मे उन विशेषताओ को उत्पन्न करने के लिए इच्छुक होना जिसका वह स्वय साधक है, आगे का कुछ बनाने का चाव और इसके लिए खुद कुछ बनने या होने की ज़रूरत, एक अच्छे अध्यापक के मस्तिष्क की बनावट का ताना-बाना है। लेकिन आजकल कई ऐसे अध्यापक भी बाजार मे मिलते है जिन्हे बस अपना पेट पालना होता है।

सच्चे अध्यापक के लिए जरूरी है, कि वह दूसरो से प्रेम करता हो, उसके दिल मे आदमी होने के नाते दूसरे आदमियो के प्रति सच्चा प्रेम हो। अध्यापक के जीवन-ग्रन्थ के मुख्य-पृष्ठ पर 'विद्या' नही लिखा होना चाहिए बल्कि 'प्रेम' शीषक होना चाहिए। उसे मानव मे प्रेम, समाज से प्रेम और समाज मे जो विशेषताए विद्यमान है, उनसे प्रेम होना चाहिए। अच्छे अध्यापक की सबसे बडी पहचान यह है कि उसकी स्वाभाविक प्रवत्ति बच्चो और नवयुवको के विकासोन्मुख व्यक्तित्वो की ओर होना चाहिए। उसे मदरसे से समुदाय ही मे अध्यापक नही होना चाहिए, बल्कि हर समय उसका मन अपने शिष्यो मे ही अटका होना चाहिए। एक अच्छे अध्यापक को बच्चो के संग बच्चा ही बन जाना चाहिए इसमे उसको शरम महसूस नही करनी चाहिए क्योकि बच्चो के साथ बच्चा बनने पर ही अध्यापक बच्चो के मनोभावो को जान सकता है। जब तक अध्यापक मे इस प्रकार का बचपना होगा तभी वह बच्चो के मन के भेदो को जान सकेगा, और उनके जीवन मे बराबर मिल-जुल कर उन्हे उन्नति की ओर ले जा सकता है। जिस अध्यापक मे

ज़ाकिर ! नाम रहेगा रोशन

सुमेर चन्द्र जैन 'मनमाना' (डिप्लोमा)

ये चमन 'जामिया' है जाकिर के अरमानों का।
रंग बिरंगे, न्यारी-न्यारी,
ये तालीमी फूलों की क्यारी
ताज-महल की तरह बसी है,
जमुना तट पर 'जामिया' प्यारी,
ये तालीम का गुलशन है, जाकिर के बलिदानों का।
कैसी लगन ले ज़ाकिर ! तुमने,
जगत में मंगल कर दिखलाया,
तिरंगे तले जमुना की रेती पर,
हमें आजादी का पाठ सिखाया,
ये वतन 'जामिया' है, इल्म के दीवानों का।
तारीफ करूं क्या ज़ाकिर ! तेरी,
तारीफ तेरी जमुना कहती,
गांव-गांव और शहर-शहर,
जो हिमालय से सागर तक बहती,
ये सबक 'जामिया' है, मेहनतकश इन्सानों का
जब तक रहेगी जमुना—
और बहती जमुना की रवानी,
ज़ाकिर ! नाम रहेगा रोशन,
और 'जामिया' तेरी निशानी,
ये गीत तो है मेरे दिल का, या होठों की मुस्कानों का।

मे उपदेश नही दिया बल्कि अपने दृष्टान्त से लक्ष्य पूरा किया है। वे एक अच्छे शिक्षक के रूप में बच्चो को उस स्थान तक पहुचा देते हैं जहा से वह स्वयं सब कुछ समझ सकता है।

राष्ट्रपति के सर्वोच्च पद पर अधिष्ठित होने पर भी इनका शिक्षा प्रेम अणुमात्र भी क्षीण नही हुआ। शिक्षा के क्षेत्र मे उनका अटट प्रयास त्याग, तपस्या तथा सेवा अविस्मरणीय है। जामिया नगर मे बनी उनकी समाधी शैक्षणिक संस्था के प्रति उनके अटूट प्रेम का सूचक है।



"अक्सर अध्यापक के भेष म ऐसे कारीगर होते है जिनके जीवन भर के प्रयत्नो से कुछ झूठे और कपटी, जो देखने मे तो बहुत अच्छे धार्मिक और नैतिक लोग हैं, पैदा होते है, लेकिन उनके अच्छे कार्यों की जडे उनके दिल तक नही पहुचती, ये लोग झूठे माल पर अपने कारखाने का ठप्पा लगा देना काफी समझते है और असली धातु का बदलने की जगह पालिश कर देने पर राजी हो जाते है।"

—डा० जाकिर हुसैन

शिक्षा, संस्कृति व सार्वजनिक क्षेत्र मे जाकिर साहब के परिश्रम का अकन असम्भव है। मौलिक चिन्तन से युक्त महान शैक्षणिक विचारक डा० जाकिर हुसैन ने भारतीय शिक्षा को नया रूप प्रदान किया है। उनका कहना है कि कला, संगीत, नृत्य का विद्यालय मे अवश्य स्थान होना चाहिये, क्योंकि ये संस्कृति के कुछ मुख्य उपकरण है, जो व्यक्ति के मस्तिष्क को परिष्कृत करते हैं, संस्कृति के इन तत्वों की बच्चो पर प्रकट करने की आवश्यकता है, अनुकूल सांस्कृतिक उपकरणों द्वारा ही मस्तिष्क की वास्तविक शिक्षा हो सकती है।

अलीगढ़ मुस्लिम विश्वविद्यालय को साम्प्रदायिक संकीर्णताओं से उभारने का श्रेय जाकिर साहब को ही है। राष्ट्रीय शिक्षा को उन्नत करने की प्रतिज्ञा और गांधी जी के आदर्शों को पूरा किया। उन्होंने कहा है कि मैंने जन-सेवा का जीवन गांधी जी के कदमों मे रहकर शुरू किया था, गांधी जी आज तक मेरे जीवन की प्रेरणा का स्रोत है, साधन और साध्य की पवित्रता मे विश्वास रखने वाले गांधी जी के बनाये हुए मार्ग पर चलकर मैं जनता की सेवा कर सकूं।

जाकिर साहब की वैसे तो रुचि बड़ी व्यापक थी लेकिन शिक्षा, कला और संस्कृति से अगाध प्रेम था जब कभी भी उन्हे अवसर मिलता था इस त्रिवेणी मे बड़े ही आनन्द मग्न होकर कल्पना मे विचरण करते थे। बुनियादी तालीम के तो शिक्षा विशेषज्ञ थे। उन्होंने हिन्दी मे 'शिक्षा' नामक पुस्तक लिखी है। इनकी कुछ अपनी मौलिक रचना है और कुछ अनुवाद के रूप मे, इन सभी मे प्रमाणिकता है। उनके विचार मे "असली शिक्षा के आदर्शों के अपने ही हाथों होनी है दूसरा घोड़े को पानी तक ले जा सकता है पानी तो उसे आप ही आप ही पीना पड़ता है। मेरी प्रार्थना शिक्षकों स्नातकों, सभी से यह है कि इस अपना काम बनाइये, ऐसा काम जिससे मन का विकास हो।" अर्थात् अध्यापक का कार्य तो बच्चे को उस स्थान तक ले जाना है, जहां से बच्चा ज्ञान प्राप्त कर सके।

उस समय स्वाधीनता आन्दोलन जोरों पर था, यह एक युग की मांग थी कि उस समय का साहित्य ऐसा रचा जाय जिससे देश के प्रति जागृति उत्पन्न हो सके विशेषकर बाल साहित्य ऐसा हो कि बच्चो के अन्दर स्वतन्त्रता की भावना, देश भक्ति की भावना पैदा हो सके। जामिया शायद पहला ही स्कूल है जिसने बच्चो के साहित्य की ओर विशेष ध्यान आकर्षित किया। इस समय ऐसी पुस्तकें तैयार की गई जो शिक्षा और मनोविज्ञान के प्रकाश मे प्रकाशित हुई तथा जो बच्चो के लिये उपयोगी थी।

जाकिर साहब ने यही उद्देश्य अपने समक्ष प्रधान रूप से रखा और उनकी कहानी 'अब्बू खां' की बकरी आजादी की सच्ची लगन पैदा करती है। इससे बलिदान की शिक्षा मिलती है। उनकी दूसरी कहानी 'उकाब' स्वाधीनता की भावना को लेकर लिखी गई है इसमे प्रारम्भ मे पहाड़ पर घास के जमने का जिक्र इस तरीके से किया गया है कि वह दृढ़ता की भावना को सर्वोपरि सिद्ध करती है। आगे चलकर दिखाया गया है कि एक उकाब किसी भी लालच मे कैद रहने पर राजी नही होता, वह लड़ता ही रहता है और अन्त मे आजाद हो जाता है तब वह कहता है—कि खुदा का शुक्र है—फिर आ पहुंचा अपने वतन मे—फिर पा लिया अपना देश। इसकी हर कहानी का विषय बच्चो के लिये विशेष महत्त्व रखता है। उन्होंने एक अच्छे साहित्यकार के रूप

शिक्षा और डा० ज़ाकिर हुसैन

पुष्पा शर्मा (बी एड)

यह तो सर्वविदित ही है कि डा० जाकिर हुसैन आधुनिक भारत के महान निर्माताओं में मुख्य स्थान रखते हैं। सांस्कृतिक आदर्शों की प्रतीक होने के साथ-साथ वे एक सफल अध्यापक तथा महान शैक्षणिक विचारों के प्रतीक भी थे। देश के सर्वोच्चपद, जिसे डा० राजेन्द्र प्रसाद और डा० राधाकृष्णन ने सुशोभित किया था, उसी पद को अपने समय में भारत के महान शिक्षाविद् डा० जाकिर हुसैन ने सजोया।

डा० जाकिर हुसैन ने शैक्षणिक चिन्तन एवं अनुशीलन के क्षेत्र में, एक महान नेता तथा एक प्रवत्तक के रूप में, देश की सेवा की। यद्यपि इनका निवास स्थान फरुखाबाद है, तथापि इनका जन्म ७५ वर्ष पूर्व हैदराबाद में हुआ। इनके पिता एक प्रख्यात वकील थे तथा आप भारत के महान शिक्षाविद् हुए। जाकिर हुसैन की प्रारम्भिक शिक्षा इटावा में हुई, जहां के हैड मास्टर सैयद अल्ताफ हुसैन से वे प्रभावित हुए। तत्पश्चात् उन्होंने अलीगढ के एम० ए० ओ० कालेज में शिक्षा प्राप्त की जो आधुनिक अलीगढ मुस्लिम विश्वविद्यालय के नाम से परिचित है, उन्हीं दिनों गांधी जी के नेतृत्व में देश में असहयोग आंदोलन छिड़ा, जिससे युवा हुसैन अत्यधिक प्रभावित हुए।

ज़ाकिर साहब के अनुसार केवल राजनीति के सकुचित द्वार से एक सच्चा व पूर्ण राष्ट्रीय जागरण प्राप्त नहीं किया जा सकता, इसकी जड़ व नव जागन शिक्षा व संस्कृति में होनी चाहिये। उस समय अंग्रेजी शिक्षा इस प्रकार की थी कि उससे भारतीय संस्कृति के विकास को धक्का पहुंच रहा था सांस्कृतिक विकास क्षीण हो चुका था। अंग्रेजी शिक्षा प्रणाली राष्ट्रीय जीवन के विकास में बाधक थी। उस समय देश को एक ऐसे महान शिक्षाविद की आवश्यकता थी जो भारतीय शिक्षा को नया मोड़ प्रदान कर सके। उसी समय जाकिर साहब का आविर्भाव हुआ। अपने देश की राष्ट्रीय व सांस्कृतिक आवश्यकताओं को देखते हुए उन्होंने अलीगढ़ में एक राष्ट्रीय शिक्षण संस्था स्थापित करने में सहायता प्रदान की। कुछ समय के अनन्तर इस संस्था को दिल्ली लाया गया जो आज जामिया मिल्लिया के नाम से प्रसिद्ध है। इस संस्था का उद्देश्य आधुनिक शिक्षण पद्धति को इस प्रकार विकसित करना था जो राष्ट्रीय संस्कृति से विच्छिन्न न किया जा सके।

उनकी याद में

भीमसिंह चालिहा (बी एड)

करता हूं उनको याद जो नेता महान थे,
इन्सानियत का ज्ञान शराफत की शान थे।

भारत के थे ये राष्ट्रपति पहले मुसलमान,
बापू के भक्त थे वतन की आन बान थे।

थे संस्थापक जामिया मिल्लिया के बेनजीर,
दिल्ली की आबरू व अलिगढ़ की शान थे।

विश्वासपात्र नेता वतन के हृदय सम्राट,
सच पूछिये तो चलता फिरता हिन्दुस्तान थे।

विद्वान बुद्धिमान थे, दिल के उदार थे,
गीता का ज्ञान ध्यान थे, अहले कुरान थे।

साहस कभी हारा नहीं आपत्तियों के बीच,
पीरों मे पीर नवयुवकों में जवान थे।

हिन्दु थे उनका दिल मुसलमान थे जिगर,
ईसाई पारसी सभी के निगहबान थे।

गुन गान क्या हो डाक्टर जाकिर हुसैन का,
भारत का जर्रा जर्रा है जाकिर हुसैन का।

एकत्र कर उन्हे छोटी-२ पहाडिया बनाकर उन पौधो का एक विशेष रूप मे लगाने का शौक था। उनके इस सौंदर्य बोध का ज्ञान जामिया नगर मे उनके मकान के बगीचे मे लगे नागफनी के पौधो से होता है।

अध्यापन व बागबानी के अतिरिक्त जाकिर साहब का एक अदभुत प्रकार का शौक था—वह था विभिन्न प्रकार के पत्थर एकत्र करने का। यह जानकर एक बार सम्भवत आप उछ पड़ेंगे कि यह किस प्रकार का शौक होता है। परन्तु यदि आप विभिन्न रूप, रंग तथा कटाव वाले इन पत्थरो को देख लें तो आपको लगेगा कि उनका यह शौक भी कुछ अर्थ रखता है। इन अमूल्य निधियो के विषय मे जाकिर साहब ने किसी सज्जन से कहा था—'इन पत्थरो से बेहतर दुनिया मे और क्या चीज मिल सकती है, ये न किसी को धोखा देते है न किसी की चुगली करते हैं, न किसी से दुश्मनी करते है, न किसी का हक मारते है, न अपनी असलियत को छिपाते है, न किसी का पर्दाफाश करते है और न किसी से नफरत।' अब आप स्वयं अनुमान लगा सकते है कि पत्थरो के सम्बन्ध मे यह उक्ति कहा तक सही है।

यद्यपि शिक्षा-ग्रहण करने का शौक सामान्यत सभी व्यक्तियो मे पाया जाता है, तथापि इसकी प्राप्ति के नाना प्रकार के उद्देश्य होते है—यथा कोई धन कमाने के लिए शिक्षा ग्रहण करना चाहता है तो कोई नाम कमाने के लिये, कोई नौकरी हासिल करने के लिये शिक्षा ग्रहण करना चाहता है तो कोई दौलत जमा करने के लिए। परन्तु ससार मे ऐसे लोग बहुत कम होते है जो केवल शिक्षा ग्रहण करने के लिये ही शिक्षा प्राप्त करना चाहते है। केवल इस उद्देश्य से शिक्षा ग्रहण करने वालो मे शीर्षस्थान पर नाम आता है—डा० जाकिर हुसैन का। जिनमे वास्तव मे शिक्षा ग्रहण करने का एक शौक था। शिक्षा की प्राप्ति उन्होने न केवल अपने शिक्षक से की थी, बल्कि विभिन्न प्रकार के स्रोतो के माध्यम से अपने ज्ञान की परिधि मे विस्तार लाने का प्रयास किया था।

इसी प्रकार जाकिर साहब मे कुछ अन्य भी शौक थे यथा बाते करने का या बाते सुनने का, उत्कृष्ट प्रकार की कृतिया एकत्र करने का इत्यादि। कृतियो का एकत्रीकरण उनके कला के प्रति वास्तविक लगाव को सूचित करता है। इससे यह भी स्पष्ट होता है कि जाकिर साहब न केवल शिक्षा-प्रेमी थे, अपितु सही अर्थों मे एक महान कला-प्रेमी भी थे।

जाकिर साहब के शौक

मिनाली घोष (बी एड)

स्वतन्त्र भारत के तृतीय राष्ट्रपति, देश के लोकप्रिय नेता व प्रभावपूर्ण शिक्षक डा० जाकिर हुसैन का भी साधारण व्यक्तियों की भांति कुछ शौक थे। सभी व्यक्तियों को कुछ न कुछ शौक होता है यथा शिकार करने का, टिकट जमा करने का, पत्रिकायें पढ़ने का इत्यादि। परन्तु डा० साहब के शौक कुछ अद्भुत प्रकार के थे।

सर्वप्रथम व सर्वप्रमुख शौक जो उन्हें था वह था पढ़ाने का शौक। यद्यपि उनके विषय में हम कदापि यह नहीं कह सकते कि अध्यापन के अतिरिक्त वे और किसी कार्य को कर ही न सकते थे। उनके विद्यार्थियों का ही कथन है कि जाकिर साहब जैसे अध्यापक इस संसार में बिरले ही दृष्टिगोचर होते हैं। अध्यापन उनके लिये केवल एक पेशा-मात्र न था, बल्कि एक नशा था। उन्होंने न केवल साधारण विद्यालयों के छात्रों को, अपितु महाविद्यालय के छात्रों को भी पढ़ाया। बच्चे बड़ी दिलचस्पी से उनसे पढ़ा करते थे। वे पढ़ाने की कला में इतने प्रवीण थे कि कक्षा के प्रत्येक विद्यार्थी के सम्मुख पाठ्य विषय पूर्ण रूपेण स्पष्ट हो जाता था। यद्यपि परिस्थितियों ने उन्हें अध्यापन कार्य में संलग्न होने की आज्ञा न दी, तथापि अध्यापन का शौक उनमें आमरण बना रहा।

अध्यापन के अतिरिक्त एक और मुख्य शौक जो उनमें था वह था बागबानी का। परन्तु उनका यह शौक साधारण मनुष्यों के शौक से कुछ भिन्न प्रकार का था। बागबानी से सम्बन्धित कार्य भी कुछ इस प्रकार से किया करते थे, मानो कोई अनुसंधान कार्य किया जा रहा हो। इस प्रकार कहने का तात्पर्य यही है कि उनके प्रयत्न में किसी प्रकार की त्रुटि न रहने पाती थी। प्रत्येक प्रकार के फूल पौधे व झाड़ियों के विषय में पूर्ण ज्ञान वे किसी न किसी स्रोत से प्राप्त करने का प्रयत्न करते थे। उन्होंने अपने अटूट परिश्रम व निरन्तर प्रयास से इतने सुन्दर गुलाब के पौधे लगाये थे कि उनके इस शौक से प्रभावित हिन्दुस्तान के मालियों ने एक गुलाब के फूल विशेष का नाम ही "जाकिर हुसैन" रखा था। उनके इस शौक का प्रत्यक्ष प्रमाण अलीगढ़ विश्वविद्यालय है। 'गुलाब प्रियता' के अतिरिक्त जाकिर साहब को नागफनी के विभिन्न किस्मों को

प्रारम्भ मे ही प्रखर बुद्धि के व्यक्ति थे। इस पुस्तक के अलावा भी आपने अपने विचारो को समाज के सम्मुख पुस्तको के माध्यम मे रखा। जाकिर साहब ने जामिया पत्रिका मे भी लगातार अपने विचारो को रखा। इसके अतिरिक्त जाकिर साहब एक उच्च कोटि के वक्ता भी थे। इसका उदाहरण हमे उस समय मे ही मिलता है जबकि वे अध्ययन करते थे और भाषणो मे आपका एक भाषण बड़ा महत्वपूर्ण माना जाता है जो कि जाकिर साहब ने 'हैरोल्ड लास्की इन्स्टीटयूट' के 'पोलिटिकल साइंस' विभाग मे जो अहमदाबाद मे है। दिया था उसका शीर्षक 'इथिक्स एण्ड स्टेट' था। इसके अलावा भी जाकिर साहब एक उच्च कोटि के विद्वान और वक्ता थे।

साहित्यिक रचनाओ के साथ-साथ जाकिर साहब ने छोटी-छोटी कहानिया भी लिखी है जो बच्चो से सम्बन्धित है और ये रचनाये भी उतनी ही महत्वपूर्ण है जितनी कि साहित्यिक रचनाए है। इस प्रकार की रचनाए 'पयाम-ए-तालीम' मे प्रारम्भिक रूप मे मिलती है। जब डा० जाकिर हुसैन उप-राष्ट्रपति थे तो उनकी एक कहानी लिखी जिसका नाम 'कछुआ और खरगोश' लिखी। यह कहानी उन्होने अपनी महाराष्ट्र यात्रा के दौरान लिखी।

जाकिर साहब की रुचि इनके अतिरिक्त प्रकृति की सुन्दरता मे थी। आपने कई बार पेण्टिग आदि मे इनाम प्राप्त किए थे। अत वे केवल शाब्दिक विद्वत्ता के अतिरिक्त अन्य स्वरूपों मे भी रुचि रखते थे। उनके रुचिकर पेन्टर्स मे हुसैन, गुजराल, रामकुमार और खन्ना थे। वे कई बार इन लोगो से मिले भी थे।

निष्कर्ष रूप मे हम सब कहते है कि डा० जाकिर हुसैन ने प्रत्येक क्षेत्र मे अपनी रुचि का परिचय दिया और एक मुख्य स्थान प्राप्त किया। इन रुचियो का बढ़ाव के लिए उन्होने एक देश-विदेश की विभिन्न समस्याए देखी और उनको एक विशिष्ट ढग से समाज के सम्मुख अपने विचारो के माध्यम से रखा। वे विभिन्न महान आत्माओ जैसे गाधी जी, डा० अन्सारी, पण्डित जवाहर लाल नेहरू आदि से काफी कुछ सीखा और अपनी प्रतिभा की भी उन सभी पर छाप छोडी और इसी कारण से भारतीय समाज मे नही वरन् विदेशो मे भी आपका नाम अमर बन गया।



"शासक आदेश देता है और अध्यापक परामर्श देता है, वह दास बनाता है और यह साथी ,"

—डा० जाकिर हुसैन

मैट्रिक तक शिक्षा प्राप्त करने के बाद जाकिर साहब सन १९१३ मे अलीगढ़ मे स्थित मोहमडन एंग्लो-ओरियन्टल कालेज मे प्रवेश प्राप्त किया। वहा पर इनके दो भाई पहले ही अध्ययन मे ख्याति प्राप्त कर चुके और बाद म जाकिर साहब ने भी वह ख्याति हासिल की। यहा पर रहते हुए जाकिर साहब कई अन्य व्यक्तियो से मिले और श्री रशीद अहमद सिद्दीकी का नाम इनके अच्छे मित्रो म लिया जाता था। यहा से इन्होने बी० ए० प्रथम सन् १९१८ मे किया। इसस पहले य डाक्टरी लाइन पसन्द करत थ परन्तु बीमार हो जान के कारण आपको वह राय बदलनी पडी। इन दिना डाक्टर जाकिर हुसैन साहब छात्र सघ के उपाध्यक्ष भी रह और भाषण में भी निपुणता हासिल करके इनाम जीते। बी० ए० करने के बाद आपने एम ए और कानून की डिग्रीया प्राप्त की।

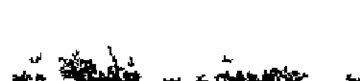
अलीगढ म शिक्षा प्राप्त करने के बाद जाकिर साहब जमनी गय और बर्लिन के विश्व विद्यालय से आपने पी० एच० डी० की डिग्री प्राप्त की। यहीं पर जाकिर साहब न जामिया व बर्लिन के कैवियानी प्रेस का सम्बन्ध कराया। सन् १९२५ में डा० जाकिर हुसैन हकीम अजमल खा, डा० अन्सारी जैस प्रतिष्ठित व्यक्तियो से मिले और जामिया की पूरी सेवा का आश्वासन उन्हे दिया।

जमनी मे लौटने के बाद जाकिर साहब ने एक भिन्न स्थिति मे देखा क्योकि यहा की वित्तीय शक्ति क्षीण हो चकी थी परन्तु डा० अन्सारी, म० गाधी तथा जाकिर हुसैन जैस महान व्यक्तियो ने इसे एक नया जीवन प्रदान किया।

डा० जाकिर हुसैन जामिया मे 'शेख-उल-जामिया नियुक्त किए गए। इस पद पर डाक्टर साहब ने सन्तोषप्रद काय किया। जाकिर साहब ने जामिया क लिय प्रत्यक बलिदान दिया और अन्य लोगो के साथ जामिया के स्तर को सुधार कर उच्च बनाया।

इसके साथ साथ डा० जाकिर हुसैन एक भारत के प्रतिभाशाली व्यक्तियो मे गिने जाने लगे। कुछ दिन तक अलीगढ मे विश्वविद्यालय के उप-कुलपति भी रहे तथा बाद मे राज्यसभा के सदस्य मनोनीत किये गये। थोडे समय बाद आपका बिहार का गवरनर बना दिया गया वहा पर भी आपने अपनी प्रतिभा का परिचय दिय और बाद मे उपराष्ट्रपति तथा फिर अन्त मे राष्ट्रपति के पद पर सुशोभित हुय। इन सभी पदा पर जाकिर साहब ने अपनी बुद्धिमत्ता और विशिष्ट प्रतिभा का परिचय दिया और एक दिन वह भी आया जो सभी को कभी न कभी देखना पडता है अर्थात् राष्ट्रपति के पद पर काय करत-करत डा० साहब स्वग सिधार गय। हमारा देश डा० जाकिर हुसैन के नाम को कभी नही भूलेगा और आपका नाम सदा अमर रहेगा।

इस प्रकार स हमने देखा कि जाकिर साहब एक धनी परिवार के होते हुये भी उन्होंने गरीबी को चुना और प्रत्यक दृष्टि स अपने जीवन का आत्म समपण अपने समाज व देश के लिए किया। जाकिर साहब का नाम हमारे राजनीतिक विचारो स ही नही वरन् शिक्षा के सम्बन्धो मे भी विस्तृत है। आपने शिक्षा के क्षेत्र मे कई पुस्तके लिखी। ये पुस्तके उर्दू व अंग्रेजी दोनों भाषाओ मे ही थी जैस आपने बी० ए० के तुरन्त बाद एक अंग्रेजी पुस्तक का उर्दू म अनुवाद किया जिसका नाम 'एलीमेंट्री' पालिटिकल इकोनोमी' था। अत स्पष्ट है कि जाकिर साहब




"डा० जाकिर हुसैन"

सुरेन्द्र कुमार निमि (बी एड)

जब हम अपने देश के नेताओ के बारे मे सोचते हैं तो डा० जाकिर हुसैन का नाम हमारे सम्मुख आ जाता है। वे राजनीतिक नेता ही नही वरन् उनका शिक्षा मे भी काफी योगदान रहा है। जाकिर साहब का सम्बन्ध एक समृद्धिशाली परिवार से था जो कि अफरीदी अफगान से सम्बन्धित था। इनका यह परिवार फर्रुखाबाद जिले मे कयामगज मे रहा करता था। इनके पिता कुछ समय औरंगाबाद भी रहे किन्तु जाकिर साहब के पिता श्री फिदाखान के मजिस्ट्रेट बन जाने के बाद उन्होने अपना मकान हैदराबाद म बेगम बाजार नामक जगह पर बनवा लिया और इसी स्थान पर सन् १८९७ मे जाकिर साहब जो कि एक महान आत्मा थी, ने जन्म लिया। इनके पिता जी को मजिस्ट्रेट का पद प्राप्त हो जाने पर इनके परिवार का सम्मान और भी अधिक हो गया। परन्तु जाकिर साहब जब केवल ८ वर्ष के ही थे, इनके पिता जी का देहान्त हो गया, वैसे इनके छ भाई अन्य थे किन्तु जीवित केवल तीन ही रहे।

जाकिर साहब की प्रारम्भिक शिक्षा 'सुलतान बाजार गवर्नमैंट हाई स्कूल मे, हुई किन्तु इनके पिता की मृत्यु के कारण इनकी माता जी इनको फिर से कयामगज ले गयी और वहा पर इन्हे एक अंग्रेजी के ट्यूटर ने घर पर ही पढाया। सन १९०८ म आपने इटावा स्कूल म दाखला लिया क्योकि यह इनकी माता जी ने अपनी प्रतिभा का ही परिचय दिया। इनकी माता जी ने साहस पूर्वक अपना कार्य किया। इटावा मे पढते हुए जाकिर साहब कुछ स्कूल के राजनीतिक क्षेत्र मे भाग लेने लगते है क्योकि उन्ही दिनो त्रिपोली युद्ध का भयानक दृश्य उत्पन्न हो गया जिसके लिए जाकिर साहब ने पीडितो के लिए चन्दा इकट्ठे करने मे मदद की।

इटावा मे ही अध्ययन करते हुए इन पर एक नई आपत्ति और आई और वह थी कि आपकी माता जी का प्लेग फैलने से देहान्त हो गया और जाकिर साहब बेसहारा हो गये। किन्तु इन्हे एक दूर के सम्बन्धि ने जो एक सूफी थे सहारा दिया और ये उन्ही के साथ रहने लगे। इन सूफी साहब का जाकिर साहब के जीवन पर बहुत प्रभाव पडा क्योकि ये सूफी एक उच्च विचारो वाले व्यक्ति थे और इनमे दान जैसी विशेष प्रवृत्ति भी थी।

कई प्रश्न एकाएक मेरे मस्तिष्क में उमड़ पड़ते हैं। बहुत जी चाहता है किसी से उन प्रश्नों को पूछूं — कई बार प्रो० मुजीब, डा० सलामतुल्ला साहब, और कई साथियों से उनमें से कुछ प्रश्न पूछने का प्रयास भी किया है। लेकिन चूंकि ये सब प्रश्न आप से ही आपके सम्बन्धित रहे हैं, आपसे ही इन्हें पूछने को दिल चाहता है।

जब आप जामिया रूपी पौधे को पानी देकर सींचते रहे थे — बाइस वर्षों तक, तब आप निश्चय ही एक युटोपियन शिक्षा संस्था की रचना का स्वप्न देख रहे होंगे और उस स्वप्न को कार्य रूप में परिणित करने का प्रयास कर रहे होंगे? आपकी उस यूटोपियन संस्था में राजनीति का क्या स्थान था? क्या उसमें भी प्रोफेसर, रीडर और लेक्चरर के पदों और उनसे सम्बद्ध सामाजिक मनोवैज्ञानिक तनावों के अस्तित्व की कोई गुंजाइश थी? आप किस टेकनीक से प्रशासन चलाते थे? यहां तब क्या आप एक लोकतांत्रिक नेता थे, या एक करिश्मा दिखलाने वाला व्यक्तित्व (केरिस्मैटिक परसनेलिटी) थे, या एक तानाशाह थे? क्या आपके उस स्वप्न संसार में विद्यार्थियों को भी तोड़ फोड़ करने और नौजवानी के आधुनिक आग्नेय करिश्में दिखलाने का कोई अधिकार था? क्या आपके युटोपिया में कानूनी न्यायालयों को भी कोई स्थान मिला था? क्या जामिया नगर ओखला के अधिकांश निर्धन, अशिक्षित, अल्प सम्पन्न व दुखी निवासियों की सेवा करने के लिये जामिया की भूमिका के सम्बन्ध में भी कोई विचार उस स्वप्न चित्र में थे? आपने शिक्षा सम्बन्धी विषयों पर जो कुछ लिखा है उसमें मुझे मेरे इन कुछ अटपटे प्रश्नों के उत्तर नहीं मिलते। किसी से पूछता हूं तो भी जो उत्तर मिलते हैं वे भी अस्तव्यस्त होते हैं। पता नहीं, आप इन पर क्या प्रकाश डालना पसन्द करते? इतना मैं अवश्य कहना चाहूंगा, यदि इन प्रश्नों के लिये आपके शैक्षिक विचारों में आपके युटोपिया में कोई स्थान नहीं रहा है, तो उनमें यह एक न्यूनता ही कही जायेगी। आप इस छोटी सी आलोचना से अप्रसन्न तो नहीं होंगे? नहीं, आप नहीं होंगे, ऐसा मुझे विश्वास है, क्योंकि आपके विचारों में उदारता, सहिष्णुता, और बौद्धिक समालोचना को उचित स्थान प्राप्त था।

हर पल मैं जामिया में आपकी खोज करता रहता हूं। यह देखने का प्रयास करता हूं कि आखिर कौन हैं वे लोग जिनको आपके महान जादुई व्यक्तित्व का पारस स्पर्श कर गया था? बुजुर्ग दीखनेवाले व अधेड़ उम्र के किसी भी जामिया के कार्यकर्त्ता को देखते ही यह प्रश्न मेरी आंखें पूछना चाहती हैं? एक तीर्थयात्री की भांति ही मैं नित्य प्रति आपके मकान, आपके चिरविश्रांति गृह तथा उनके बीच में स्थित आपकी कर्मस्थली के इर्द-गिर्द घूमने-फिरने वालों के बीच आपके उत्साह, आपकी प्रेरणाओं और आपकी दिव्यता की झलक पाने के लिये उत्सुक रहता हूं। अब तक मुझे कई निराशायें भी मिली हैं तो कई आशाएं भी, लगभग बराबर बराबर के परिमाणों में। पर अभी भी यह खोज जारी है। इसलिये अभी अपनी खोज के परिणाम नहीं लिख सकता। अगले पत्र में (न जाने कब वह लिखा जायेगा), मैं अपनी खोजों के परिणाम लिखूंगा। आपके प्रेरणास्पद शब्दों का प्रकाश मेरे मन में भरा है और मैं पूर्णतया प्रसन्न व कर्त्तव्यरत हूं।

आशा है आप सानन्द होंगे।

शुभ कामनाओं सहित!

आपका कृपाभिलाषी,
सत्यपाल रुहेला

निहायत शराफत थी   एक बिरादरी की भावना और लगन से सबके साथ सलूक करते थे आदि, कई बातें मुजीब साहब ने आपके बारे में कही थी।

फिर आप जब राष्ट्रपति बने तो पत्र-पत्रिकाओं में आपके विषय में बहुत से लेख व सम्मरण छपे। इस बीच मैंने आपकी 'भारत में शिक्षा का पुनर्निर्माण' और कुछ विश्वविद्यालीय दीक्षांत समारोहों के भाषणों व लेखों को भी पढ़ा था। मुझे ऐसा लगा है कि आपने अपने जीवन के आरम्भिक वर्षों में एक शिक्षा मनोवैज्ञानिक की जैसी सूझबूझ का ही अधिक परिचय दिया था, लेकिन धीरे-धीरे आपका दृष्टिकोण सांस्कृतिक पक्ष की ओर अधिक झुकता चला गया और आप मेरे विषय समाजशास्त्र की भावना के पर्याप्त निकट आते गये। आपका नाम एक महान उदार-वादी और सांस्कृतिक मूल्यों के महत्त्व को समझने वालों में अग्रणी के रूप में लिया जाने लगा। धर्म-निरपेक्षता, धर्म, संस्कृति, मुसलमानों की तालीम—इन चारों पक्षों पर आपने जो कुछ लिखा और बोला है, उसमें आलोचक लाख यत्न करने पर भी कोई अनियमितता या छिद्र नहीं ढूंढ पाते। आपने उत्तम चरित्र, उत्तम मूल्यों व उत्तम सामाजिक सम्बन्धों की महत्ता का वर्णन स्थान स्थान पर किया है। यह भी सच है कि आपने प्रेम, भाई-चारे के साथ ही साथ कई बार बहुत ही खरी-खरी बातें भी कही हैं, जैसे "वमन से बुनियादी तालीम को चलाने से तो बेहतर है उसको खत्म ही कर देना", "बुनियादी उस्तादों ने ही बुनियादी शिक्षा का जनाजा निकाल दिया है", "देश का नेतृत्व घटिया किस्म का है इसीलिए तो शिक्षा का दिवाला निकल रहा है", आदि आदि।

आपके आरम्भ के लेखों को पढ़ने से और आपके बारे में बताने वाले कुछ बुजुर्गों की बात-चीतों से यह पता लगता है कि आप एक प्रकार के "युटोपिया" (आदर्श संसार) के निर्माण में वर्षों तक—बाईस वर्ष तक, जामिया में खूब डट कर कार्य करते रहे थे। १६४८ में आप अलीगढ़ मुस्लिम विश्वविद्यालय चले गये थे, और कहते हैं उसके बाद से आपके स्वर्गवास के समय तक आपकी रुचि जामिया की शिक्षा सम्बन्धी समस्याओं और आपके उस अपूर्ण "युटोपिया" को पूरा करने की ओर नहीं जा सकी थी। न जाने क्यों? उच्च पदों की गौरव-गरिमा को रखने तथा निष्पक्षता व आदर्शों को ऊंचा बनाये रखने के लिए ही सम्भवतः आपने महत्त्वपूर्ण पदों पर आसीन होने के बावजूद भी जामिया को कोई विशेष रियायत या विशेष सरकारी सहायता नहीं दिलवाई होगी। पता नहीं आपको यह जानकारी अब तक मिली है या नहीं आपके कुछ पुराने कृपाभाजक अब सम्भवतः इसीलिये आपसे बहुत कुछ खफा हैं कि आपने आजकल के कई राजनैतिक नेताओं और उपकुलपतियों की व्यवहार प्रणाली के अनुसार व्यवहार नहीं किया, उनको ऊंचे पद नहीं दिलवाये और इससे उनकी उम्मीदों पर पानी फिर गया था। याद तो फिर भी करते ही हैं आपको वे लोग भी।

टीचर्स कालेज में प्रधानाचार्य के कमरे के बाहर और सीढ़ियों के सामने आपका एक भव्य तैल चित्र आज भी लगा है। जब आप जामिया के उपकुलपति थे तब का यह चित्र रहा होगा। उसमें चित्रित आपका रोबीला मांसल चेहरा, मादक नेत्र, व सादा किन्तु गौरव गरिमा-युक्त परिधान आपकी युवावस्था, आपके युवा स्वप्नों आपके दृढ़ निश्चय और कर्मठ जीवन की मनोहर कहानियों का तत्क्षण स्मरण करा देता है। मैं जब कभी आपका वह सर्वोत्तम चित्र देखता हूं तो

"मदरसा किसी बड़े जालिम का ईजाद है ", "यह (बच्चा) सचमुच अधिक प्राचीन है । लाड़-प्यार की ज्यादती ने इसे "मिर्जा" फोया बना दिया । मैंने सोचा कि आपकी कठोरता के कारण यह जिन्दगी या कम से कम आदमियों से ही घृणा करने लगे ।" "अच्छे अध्यापक की सबसे पहली और सबसे बड़ी पहचान यह है कि उसकी स्वाभाविक प्रवृत्ति बच्चों और नवयुवकों के विकासोन्मुख व्यक्तित्वों की ओर होती है । उन्हीं में वह एक इस संतोष मिलता है उनके बिना दुनिया में वह परदेशी की तरह भटकता फिरता है ।" आपके यह वाक्य तब से ही मेरे स्मृति-पटल पर पक्की स्याही से लिखे गए हैं । और हाँ, लम्बी सफेद दाढ़ी वाले उस बूढ़े की कहानी, जिसमें एक बालिका के एक छोटे से जिज्ञासा भरे प्रश्न 'बाबा, जब आप सोते हैं तो आप दाढ़ी लिहाफ में अन्दर रखते या बाहर ?" ने उसे रात भर इस अजीब उधेड़बुन में डाल दिया था कि वह दाढ़ी लिहाफ के अन्दर रखे या बाहर, जो आपने उस पुस्तक में लिखी थी, को मैं अब तक नहीं भूल सका हूं । "थाली में लुढ़कने वाले बैंगन", "कम पुजारी", आशा की किरण' आदि जो जो विशेषण आपने शिक्षकों के लिए प्रयुक्त किये थे वे मेरे जैसे नौजवान शिक्षक को तब झकझोरने के लिये पर्याप्त रूप से प्रभावपूर्ण थे । अब तक नहीं भूल सका हूँ मैं आपके उन सभी 'विद्युतमय शब्दों' को ।

आपकी उस पुस्तक को पढ़ने के बाद कई दिनों तक मैं सोचता रहा था कि अवश्य ही आपने बहुत ही निकट से बालकों की प्रकृति का अध्ययन किया होगा, अध्यापकों के साथ कंधे से कंधा मिला कर पढ़ाया होगा और उन पर प्रशासन किया होगा और अवश्य ही जन-साधारण के साथ घुल-मिलकर आपने वह जादुई तरीका सीखा होगा जिससे जटिल से जटिल बात को भी आप सरल और चटपटी भाषा में रख सके थे । आपकी कर्मस्थली जामिया मिल्लिया को देखने की मेरी तब ही से उत्कट इच्छा थी । १९५८ की बात है । मुरादाबाद के निकट अपने मामा के गांव जाते हुए मैं एक दिन के लिए दिल्ली में ठहरा था—केवल मात्र आपकी जामिया मिल्लिया देखने के लिए । बड़ी मुश्किल से लगभग तीन बजे तक वहां पहुंच पाया था । न किसी को जानता था, एक दो साहब मिले, जल्दी में थे, इधर-उधर कुछ देखा लौट गया—अतृप्त, असंतुष्ट, अनमना सा । १९६१ में फिर एक बार जामिया आने का मौका मिला—सोचा था कहीं ऐसी प्रदर्शिनी होगी जहां आपके चित्र, लेख, वस्तुएं होंगी, ऐसे लोग होंगे जो मुझे आपके गौरवमय व्यक्तित्व के बारे में बतलायेंगे, सम्भवतः आप ही वहां टहलते हुए गुलाबों के किसी बगीचे में मिल जायेंगे । पर ऐसा कुछ नहीं हुआ ।

१९६७ में जब मैं राष्ट्रीय शैक्षिक अनुसंधान व प्रशिक्षण परिषद, नई दिल्ली में काम कर रहा था, मेरे एक साथी डा० राजेन्द्र पाल सिंह (जो तब आपके शिक्षा सम्बन्धी विचारों पर एक पुस्तक लिख रहे थे) के साथ जामिया के उपकुलपति व आपके अनन्य मित्र व सहयोगी प्रो० मुजीब से आपके बारे में बातचीत करने आये थे । वे मुझे भी साथ में लेते आये । प्रो० मुजीब ने डा० सिंह के प्रश्नों के उत्तर में आपका जो रोचक शब्द-चित्र प्रस्तुत किया था वह उस चित्र से मेल खा रहा था जो मेरी स्मृतिपटल पर आपके बारे में १९५६ की उस रात्रि को ही उभर चुका था । "जाकिर साहब बड़ा जोश था उनमें बहुत जल्दबाजी थी, एक काम को हाथ में लेते थे, तुरन्त दूसरे को लेने की सोचते थे, थकना जानते न थे, जबरदस्त माद्दा था उनमें काम करने का, औरों को उत्साहित करने का । अपनी बात मनवाने का, लोगों के दिलों को जीत लेने का ।

स्व० डा० जाकिर हुसैन साहब को एक पत्र

डा० सत्यपाल रुहेला (रीडर)

टीचर्स कॉलेज
जामिया मिलिया इस्लामिया
नई दिल्ली-२५
जनवरी , १९७३

महोदय डाक्टर साहब,

आदाब अर्ज। बहुत दिनों से आपको पत्र लिखने का विचार दिल में उमड़ता-घुमड़ता रहा है। मैं जामिया मिल्लिया इस्लामिया में एक शिक्षक हूं। मैं उन सौभाग्यशाली व्यक्तियों में से नहीं हूं जिन्हें आपके २२ वर्षीय उपकुलपतित्व की अवधि में आपके महान नेतृत्व में शिक्षक होने का अवसर मिला हो या जिसे आपके द्वारा संचालित शिक्षा संस्थाओं में विद्यार्थी होने का गौरव प्राप्त हुआ हो। सच तो यह है कि आपके निकट दर्शन तो मुझे केवल उसी दिन हुए थे जबकि आप लगभग छ वर्ष पूर्व गणतन्त्र दिवस समारोह के अवसर पर झांकियों के जलूस को देखने के लिए इण्डिया गेट पर राष्ट्रपति की बग्घी से उतरे थे। श्रीमती गांधी ने आपका स्वागत किया था और तब आप बड़े बड़े राजनैतिक नेताओं और अधिकारियों की भीड़ में तुरन्त ओझल हो गए थे। उस एक क्षण की आपकी छवि आज भी मेरे मस्तिष्क के स्मृति-पटल पर थिरक रही है। सौम्यता, गौरव और विशालता की आपकी वह छवि बार-बार स्मृति पटल पर आती है।

मैंने चाहे आपको निकट से इतना अल्प रूप में देखा हो, लेकिन सच तो यह है आपसे मेरा परिचय परोक्ष रूप में बहुत पहले हो चुका था। आज भी मुझे वह रात्रि याद आती है जबकि मैंने सरदारशहर (राजस्थान) में गांधी विद्या मन्दिर में बी० एड० विद्यार्थी के रूप में आपकी पुस्तक "शिक्षा" ("तालीमी खुतबात" के हिन्दी अनुवाद) को पढ़ना प्रारम्भ किया था। पहली जनवरी १९५६ की वह कड़ाके की सर्दी की रात थी। रेगिस्तान के बीच स्थित छात्रावास के एक छोटे से कमरे में लालटेन के प्रकाश में मैंने, अपने सभी साथियों के सो जाने के बाद, लगभग दस बजे आपकी पुस्तक को पढ़ना प्रारम्भ किया था, और रात्रि के ढाई बजे तक उसे पूरी तरह से पढ़ कर ही सोया था। साढ़े चार घण्टे के उस शैक्षिक साहचर्य में ही आपने मुझे अत्यधिक मोहित किया था। इक्कीस वर्ष की आयु थी तब मेरी, आदर्शों की टकराहटों, आकांक्षाओं और स्वप्नों की आंख-मिचौनी में खेलता हुआ मैं तब शिक्षक के व्यवसाय का प्रशिक्षण प्राप्त कर रहा था। आपकी उस पुस्तक की भाषा और सामग्री ने मुझमें विद्युत जैसी सनसनाहट उत्पन्न कर दी थी।

सम्पादकीय

पुष्पा शर्मा (बी एड)

स्वर्गीय डा० जाकिर हुसैन न केवल हमारे राष्ट्रपति ही थे बल्कि हमारे विश्वविद्यालय-जामिया मिलिया इस्लामिया के संस्थापक भी थे। जामिया और जाकिर साहब एक दूसरे के इतने करीब थे कि जामिया का नाम आते ही जाकिर-साहब के जीवन की अनेक घटनाए याद आ जाती है। ऐसा लगता है मानो जामिया की प्रत्येक वस्तु पर जाकिर साहब की छाप लगी हुई है। सौभाग्य की बात है कि इसी वर्ष डा० जाकिर हुसैन की ७५वी वर्ष-गाठ मनाई जा रही है।

इस अवसर पर टीचर्स-कालिज की पत्रिका का एक महत्वपूर्ण अश जाकिर साहब के प्रभावशाली व्यक्तित्व, शिक्षा मे उनके अतुलनीय योगदान तथा उनके सामाजिक जीवन की झलकियो से सम्बन्धित है। अपने कालिज के सभी सदस्यो ने समयाभाव तथा अन्य कठिनाइयो के साथ योगदान देकर अपनी रचनात्मक शक्ति का परिचय दिया है और अपनी रचनाए देकर पत्रिका के सफल प्रकाशन मे योगदान दिया है, हम उनके आभारी हैं। हमे खेद है कि स्थानाभाव के कारण कुछ रचनाए प्रकाशित नही की जा सकी है।

अनेक सीमाओ के होते हुए भी हमारे लघु प्रयास का यह पुष्प आपके सम्मुख प्रस्तुत है।

विषय सूची

डॉ० जाकिर हुसैन साहब की याद में

अध्यापक महाविद्यालय वार्षिकी १९७२--७३

जामियामिलिया इस्लामिया,
जामिया नगर, नई दिल्ली

(c) The Diploma (Basic) II year students visited Agra, Mathura and Fatehpure Sikri from Dec 21 '72 to 23, 1972 under the leadership of Dr S P Ruhela

(d) The Diploma (Art) II year students visited Udaipur Chittor Fort and Jaipur under the guidance of Pt Tula Ram Gaur

12 The Intra mural Volleyball tournament was organised in December, 1972. The Azad House was the winner and the Tagore House was runner-up

13 The students and the teachers of the Teachers College Gujarat Vidpyapith visited our college on November 21, 1972 Dr Salamatullah, the Principal, addressed the students and they were shown various departments and the institutions of the Jamia Millia Islamia

---

QUOTATIONS

URMIL SAPRA

In prosperity our friends know us but in adversity we know our friends

Prayer is not asking It is a longing of the soul It is better in prayer to have a heart without words than words without a heart

A true friend halves our sorrows and doubles our joys

Love is the only thing which increases when we share with each-other

Think positively —"A glass is half-empty" or "it is half—full"—are the two ways to express the same thing, one is negative, the other positive

The test of courage is not to die but to live

(Alfieri)

The fundamental defect of fathers is that they want their children to be a credit to them

(B Russele)

There are two tragedies in life One is not to get your heart's desire The other is to get it

(Bernard Shaw)

3 The Students' Council organized an Orientation Picnic of the Teachers' College on Sept 2, 1972 at Qutub Minar All the students and the members of the staff participated in the programme, It was a good get together

4 The Azad House invited Hindi and Urdu poets of Jamia Millia on Sept, 28, 1972 to recite their (Kalam) poems The programme was good and appreciated by the students and the staff

5 The Nehru House organised an Inter-House debate contest on Nov 25, 1972 in the college hall The topic of the debate was

"In view of the problem of unemployment women should remain confined to home and not take up paid work"

6 The Ajmal House organized an Inter-House Ghazal and Kavita recitation contest on December 7, 1972 The first individual prize was won by Miss Nirmal Makkar, the second by Mrs Sanjeeda Rehman and the third by Miss Veena Ramtri

7 The Students Council deputed Miss Veena Ramtri and Miss Nirmal Makkar to participate in the Inter-College Ghazal recitation competition organized by the Urdu Association of the Lady Shri Ram College for Women on Sept 25, 1972 Miss Veena Ramtri was awarded third individual prize

8 The Students' Council prepared and displayed a daily News Bulletin of the 1972 Olympic Competitions held in Germany The bulletin presented daily records of the Olympic Sports events, photographs of champion athletes and players

9 In October, the Students' Council collected a sum of Rs 40/- from the students to help a retired peon of the Delhi University

10 The Students Council also collected Rs 30/- from the students for the relief work of the refugees of the Jammu and Kashmir National Camp

11 **Educational Tours & Excursions**

(a) The educational tour for the 61 B Ed & B Ed (Art) students was organized from December 16 to 27'72 Mr Ghulam Dastgir was the party leader They travelled in a Railway reserved bogie and visited Ajanta Ellora, Aurangabad, Bombay, Ahmedabad, Udaipur and Ajmer

(b) A batch of 45 students of the B Ed & B Ed (Art) class visited institutions of educational and cultural interest in Delhi and around under the guidance of Mr Ikram Ahmad, Mr Abu Yusuf, Mr M A A Hashmi and Mrs R Taqvi

STUDENTS' COUNCIL ACTIVITIES

Miss NIRMAL MAKKAR B.Ed

1 The elections of the Students' Council were held on August 7, 1972 The following office-bearers and the House Representatives of the Council were elected -

President	--Miss Nirmal Makkar (B Ed)
Secretary	—Mr Mam Raj Rathor (Dip /Basic)

Azad House

(i) Mr Mohd Akram Farshori	—B Ed
(ii) Miss Prabha Bhandari	—Dip Basic

Ajmal House

(i) Miss Nirmal Makkar	-B Ed
(ii) Mr Jai Prakash Narain	—Dip Basic

Gandhi House

(i) Miss Sushma Narula	—B Ed
(ii) Mr Mam Raj	– Dip Basic

Nehru House

(i) Miss Neeta Bhandari	—B Ed
(ii) Mr Shakeel Ahmad	—Dip Basic

Tagore House

(i) Mrs Usha Nayar	—B Ed
(ii) Mr Sumer Chand Jain	— Dip Basic

2 The Students' Council of the Teachers' College was inaugrated by the Vice-Chancellor, Prof Mr Mujeeb on August 19, 1972 at 11 00 a m The function began with the recitation of certain texts from the holy books from different religions, Bhajans and songs The newly elected president, Miss Nirmal Makkar of the B Ed class introduced the newly elected office bearers of the Council and the Vice-Chancellor addressed the students

The teacher is functioning like a multi-track tape-recorder One track is working making sounds and noises for the people around yet another recording her unsaid words "What can he have written? Will he give me an A B C? Never Mind!" The bell rings The supervisor makes or exit The teacher charges for her 'planning book' and the next moment she is seen darting out of the room hunting for a quiet corner where she can devour all the meat in the pie 'Hrumm! Not too bad for the first catch Some points' have been made These deserve attention We shall see what we can do about them Thank God, the first round is over"

One day slipped into another The setting remained the same The only furore in the monotone of the proceedings was caused by a constant change of supervisors The variety of supervisors added variety to the otherwise dull picture They came, they wrote, they never spoke and they went away The pile of the remarks mounted and along with that the confusion in the mind of the pupil teacher She toiled and she tumbled (her steps being heavy because of her three kids at home), she went through the tussle, and finally she was trundled out of the oven, nicely browned on a tray

MORAL 'THEY COME TO MAKE NOTMAR

"HAIL THE SUPERVISOR"

Mrs USHA NAYAR (B Ed)

The stage is set in a practicing school A pupil teacher quaking within herself A group of young imbeciles age 10-11 showing mixed reactions—mischievous and curious The horn rimmed bespectacled teacher sitting in the rear, completely certain that her class will go to the 'DOGS' now that an experimenting intruder had come in To complete the picture, walks in a supervisor from the training college with a big, black, bulky brief-case under his arm -working a perfect picture of a confident critic who has been invited to an art gallery to pass judgement on a 'new born' artist

The value of criticism is immense But for some mighty critics, the world would have forgotten Shakespeare and Byron, Beethovan and Rembrandt, Charlie Chaplin and Greata Garbo 'It is the hand of a critic that makes an artist Yet, lucky was Shakespeare, whose critics were born later than him and a vote of sympathy for the pupil teachers whose artless art is being assessed as it is created Who says its the future of the Nation alone which is being fashioned in its classrooms, the future of the future teachers is also being shaped there

We digressed a lot from our main issue getting back to the scene one witnesses much activity – the pupil teacher speaking (at times to herself and at others to the black board), writing furiously on the great 'B B' (writing with one hand and rubbing with the other) pulling the children out of their seats so that they speak She is worried lest she is charged with being over-fond of her own voice

There is more than meets the eye She is constantly watching from the 'pencil-made corners of her eyes —the hand of the supervisor moving on her 'planning book—the hand that writes and moves on One is convinced about the saying the hand that writes the REMARKS rules the minds of the pupil-teachers '

is a Christian It admits the fact that all religious communities have their own beliefs and moral and cultural traditions It believes, therefore, in education conforming to beliefs and spiritual and cultural values and in the inevitability of their being different It insists on the appreciation of the reasons which make all the constituent communities of the Indian people different and therefore, inculcates not polite indifference or passive tolerance, but an active companionship and cooperation Mahatma Gandhi, who was one of the founders and one of the greatest lovers of the Jamia Millia, insisted that it should maintain its identity as a Muslim if not an Islamic institution and that it should help young people towards self-realisation as citizens through their inherited religious and moral values The Jamia Millia Islamia has retained this character, and one of the great reasons for its ability to retain this character is the discovery every non Muslim student makes that the Jamia Millia belongs to him

Another element in the atmosphere of the Jamia Millia is what would rather crudely be described as democracy There is, of course, the necessary division of functions, the necessary grading of salaries, but the highest is not high and the lowest is not low Perhaps no one in the institution is satisfied with his salary or his living conditions, but there is no one to whom the right to complain privately and publicly is denied It is not often that employees of the Jamia Millia leave it because of better conditions of service elsewhere The reason is that here they have a sense of freedom and equality, of a value equal to the value of all other members of the educational community Here nothing is resented more keenly than the master servant or superior-subordinate relationship This is true not only of the teachers but also of the administrative and ministerial staff It is true also of students, who are expected to talk freely with the teachers and who are reminded all the time that education is possible only if the teachers and the students cooperate, and a student can nullify the whole effort put forth by his teachers if he just refuses to cooperate The student is thus made to feel that the institution depends on him and not he on the institution for the attainment of those objects for which the institution exists

But all these values are, in fact, the indirect result of the aim of the Jamia Millia to make itself as useful as possible It has experimented in methods of education at the primary and secondary level, and made a not inconsiderable contribution to the progress of adult and social education Its contribution to Urdu literature is substantial It is generally considered by those who know it as one of the most responsive institutions in the country Unfortunately, we Indians suffer from having a double standard , we admire one thing and prefer another for ourselves The ideals of the Jamia Milla have been recognised as valuable, but the people before independence and the Government afterwards have been rather slow in helping the Jamia to fulfil its aims The question, What is the Jamia Millia, is still being asked and still it happens that people do not wait for an answer

THE JAMIA MILLIA ISLAMIA

Prof M MUJEEB

Hardly any educational institution which follow the prevailing pattern have to answer the question why they were established This provides them security, but also prevents them from doing some necessary thinking That is why we find the number of institutions increasing and ideas about true education becoming more and more hazy The Jamia, Millia when established in 1920, proclaimed the reasons for its being brought into existence Since 1920, the question as to what purpose the Jamia Millia is intended to serve has been asked over and over again The motives of those asking the question have been different Some wish to know why the Jamia Millia has not followed the prevailing pattern and taken an unnecessary risk , some wish to be told about new patterns of education, some wish to understand before committing themselves to any form of admiration some wish to admire without really understanding, This is the fate of all men and institutions that aim at being "different The Jamia Millia has been ' different ' for 49 years

Till independence, those who worked in the institution did not have any economic security Therefore, they aimed at security of another type They created an atmosphere in which all who were serving the Jamia Millia felt as if they belonged to one another and to the institution, an atmosphere in which people could be called upon to exercise initiative, ' for the greater glory" of the Jamia community The student in the Jamia Millia became an asset because the number of students was small, and if education failed to raise him above a certain academic level because of lack of basic aptitudes, he could still be brought up as the member of a family living on ideals and striving for their attainment Finally, this family of teachers and students developed a certain type of social sensitivity and turned its energies, however limited, to the most immediately useful educational tasks

The Jamia Millia still retains its cultural individuality It does not that evade the issue, for instance, of emotional integration It admits boldly that the Muslim, is a Muslim the Hindu is a Hindu, the Sikh is a sikh and the Christian

TO THE POLITICAL LEADERS

Dr ZAKIR HUSAIN

"You are all stars of the political firmament there is love and respect for you not only in thousands but in millions of hearts I wish to take advantage of your presence here to convey to you with the deepest sorrow the sentiments of those engaged in educational work The fire of mutual hatred which is ablaze in this country makes our work of laying out and tending gardens appear as sheer madness This fire is scorching the very earth in which nobility and humanity are bred, how can the flowers of virtuous and balanced personalities be made to grow on it? How can we provide adornment for the moral nature of man when the level of conduct is lower than that of beasts? How shall we save culture when barbarism holds sway everywhere how shall we train men for its service? How shall we safeguard human values in a world of wild beasts? These words might appear harsh to you, but the harshest words would be too mild to describe the conditions that prevail around us We are obliged by the demands of our own vocation to cultivate reverence for children, how shall I tell you of the anguish we suffer when we hear that in this upsurge of bestiality even innocent children are not spared? An Indian poet has said that every child that is born brings with it the message that God has not altogether despaired of mankind, but has human nature in our country so lost hope in itself that it wants to crush these blossoms even before they have opened? For God's sake, put your heads together and extinguish this fire! This is not the time to investigate and determine who lighted this fire, how it was lighted The fire is blazing it has to be put out It is not a question of the survival of this nation or that nation, it is a question of choosing between civilized human life and the savagery of wild beasts For God's sake, do not allow the very foundations of civilized life in this country to be destroyed as they are being destroyed now'

Address Jamia Silver Jubilee 1946

thoughts and feelings, and you will not face life like an internally torn and dissipated busybody

One expects all this of an educated person But education is a process that never ends and in its essence, it is always self-education If you do not fulfil all these expectations today as might well be, do not get disheartened It is never too late to begin one's education Work on yourself with faith and determination and hammer yourself into shape Hard, indeed, is the way and long But you are young Go ahead steadily with courage and humility on the road that leads from individuality through character to personality May "the Protector of Travellers" bless the way !"*

"I have taken a good deal of your time But before I close I should say a word to those who have taken their degree today Young friends ! From the comparatively privileged shelter of your Alma Mater you are going out to the rather exposed field of what is simply called "life" It is said to be hard going but many before you have gone through it manfully If you are carrying with you a disciplined mind that can think systematically and look at things objectively if you have acquired the precious habit of self criticism with a view to constant self improvement , if you have learnt to live helpfully with others , if, while obliged to take, you are also ready to give , if you can put in honest and sustained work if you have learnt to get joy out of work well done and can refuse to be easily disappointed if all does not go well , if you can think with the sage and the saint but talk with common men you will go far in life If your stay at the University has not equipped you with these qualities, it is, indeed, a pity But it is never too late to begin You can still hope to acquire them if you will

One final word of advice, and I have done Never forget vigilantly to watch your own moral progress Never be satisfied with the lower if the higher is known to you and can be reached, even though with difficulty Never succumb to the appeal of a narrower at the expense of a wider loyalty Give of your best to your people and prize their freedom — which is the condition precedent not only for moral growth but for moral existence itself — yes, prize their freedom above your life Survival is not the highest moral value There are terms on which survival is a sin There are values for defending which life is too small a sacrifice, and freedom is one such value Only so is moral advance possible, and moral advance is the justification and the destiny of Man Be ever true to that destiny May God help you ! He is known to help those who help themselves ' **

* Convocation of the University of Calcutta January 20 1959

** Convocation of the University of Utkal, Cuttack, December 6, 1959

being One-sided development is an easy way out But the easy way in this case is not the right way It is not right for the individual whose perfect growth and development require that he should face the conflict and reach an equilibrium It is not right for the nation to provide for its all-sided activity by the one sided growth of its members Lineal growth is not a characteristic of organic development It is not right to have a group of saints and another of sinners, a class that works only with the hands and a class that works only with its wits, a class that gives its life-blood to create new values and a class that just enjoys them We should not seek to base the perfection of our national life on the multiplicity of individual defects We should aim at the perfection of the whole through the perfection of the parts We should be ready for the material just as much as for the ideal, for innner contemplative experience as well as for outward activity, for suffering as much as for enjoyment. We should learn to stand with our feet on firm ground and to converse with the stars on high "*

"I suppose I should end by saying a word to those who have received their degrees today Entering what is called "life", after the comparatively sheltered and in some ways comparatively irresponsible period of university study, is quite a thrill I hope pou realize that a degree conferred at the end of your university work is by no means an indication that your education has come to an end One would be happy if it has begun The degree, if anything is an assurance that you may go through the harder school of life with some measure of self-confidence that you will be able to educate yourself in it It is a long school which lasts a life time Many people have to go to it without the initial advantages that you may be expected to possess while entering it

You may be expected to enter it with a degree of humility which characterizes all who are anxious to grow and to learn and to serve

You may be expected to possess a certain breadth of intellectual horizon with reference to values attached to things and persons You will not enter life, like some others, with blinders

You may be expected to have an urge towards moral development as free persons under self-imposed discipline which alone can render that development possible This urge will constantly press towards perfection in your own person and in the society around you You are surely not entering life with the conceit that you are all that you can be

You may be expected to have a flexibility of mind which will prevent you from hurling yourself at life like a hard-boiled egg

You may be expected to owe allegiance to some absolute values, thus ensuring for yourself a central focus which could radiate all your actions and

* Convocation of the University of Lucknow, January 28, 1958

to work with dirty hands and impure hearts It is sacred work You may not put your hand to it with discord within you, discordant souls within cannot produce harmonies without It must be clear to you that in order to undertake the immense responsibility, moral qualities of the first order are essential It is further essential that the younger generation possessed of these moral qualities should be able to put forth a united, coordinated effort for a considerable length of time The great national edifice will not spring forth from India's soil for the wishing of a few persons, however great It would represent the fruit of the sustained and united lifelong effort of those who are young today Will the young generation strive to generate these moral qualities ? Will it, given these qualities, know how to combine and to cooperate, completing and being completed one by the other ? One has to be a great optimist to answer these questions in the affirmative I am such an optimist First because I have never felt the necessity nor seen the utility of being a pessimist and secondly, because something deep down in the seems to furnish me with the belief that Providence has destined India to be the loboratory in which the greatest experiment of cultural synthesis will be undertaken and successfully completed India's mission in world history seems to me to be the evolution of a distinct type of humanity combining and harmonizing in itself the virtues of the diverse types which history has produced, all blended to gather to form a new type that might evolve a characteristic and, perhaps, more satisfactory pattern of civilized existence than those in vogue at present

I wonder if you share my belief But if I can persuade the younger generation of my countrymen to do so, I would have brought them face to face with a great educational challenge For they would see unmistakably that they could not be helpful in bringing about such a consummation unless they deliberately attempt and successfully achieve a harmony within themselves They will have to strive for an all-round harmonious development of their own personalities Perfect all round development is an equilibrium Not the simple equilibrium of other living things which just adapt themselves to their surroundings and are spared any inner conflicts of the soul to reconcile Man is made to lose and then rediscover his equilibrium His is an equilibrium of a rebirth from the travails of irreconcilable inner contradictions It is the pride and privilege of humanity and an indication, perhaps, of man's place on the borderline between the animal and the divine Placed under the sway of conflicting urges, we are yet given the poetic quality of composing a harmonious life The irresistible appeal of the material and the forceful urge to flee from things of this earth , the egotism of selfish self-assertion and the self-denial of "love thy neighbour as thyself,' the callous indifference of indiscriminate destruction and the smiling martyrdom of willing self-sacrifice , the pride of domination and the humility of sefless service , the greedy watchfulness of worldly calculation and the self-forgetfulness of dreaming great dreams , the will to enjoy and the willingness to suffer , the storms of passion and the quiet placidity of knowledge—these and ever so many more are the conflicts and contradictions which an inscrutable providence has woven into the mysterious fabric of our

ZAKIR SAHEB'S CALL TO THE YOUTH

Compiled by PRABHA RAI CHAND (B Ed)

"Young friends ! If I knew of any contrivance by which I could reach your heart, I would put just this one conviction into you, that you are privileged to be workers in the construction of a sacred edifice It is given to you young friends, to be builders of an edifice far more enduring far nobler, far greater than all the beautiful and grand edifices of the world—the glory and the grandeur that shall be the India of the future To some in history it is given only to demolish, some are destined to make minor alterations, others are required to keep an edifice in good repair It is given to you to build It is a great opportunity and a great privilege But it is a great responsibility, too Can you, will you take up the great responsibility ? You cannot take it up if you are impatient and in haste The task is long, it demands throughness, and requires time You cannot hope to help effectively if you can only work by fits and starts It requires steady effort Overstrung nerves, followed by moods of blank and paralyzing despair have to be guarded against You had better keept away if failure engenders disappointment in you, and disappointment despair Failures there must be, many and frequent Only they shall venture to work here who can turn every failure into food for renewed vigour Many will not agree with the way you seek to build this noble edifice and may vehemently oppose you Those in whom this opposition can create bitterness and utter loss of faith in the opponents, will not act wisely if they set about hedging this shrine of liberty round with walls of prejudice, driving the builders into the enclosure to nourish dull hatred and a sullen sense of wrong, and shut themselves in stern isolation from the healing touch of the larger life of the world You cannot take upon yourself this great responsibility with a spirit of negation and distrust lurking within you, for these will render you intellectually too bankrupt and morally too sterile for the mighty effort You cannot approach the great task with suspicion and irreverence, for something more robust and more energizing is required to give you the strength to address yourself to the Herculean project and to sustain you while you are at it You cannot shoulder the responsibility if you proceed

1957 Appointed Governor of Bihar in July

1958 Delivered Vallabh Bhai Patel lectures on Dec 12, 13,14 on 'Educational Reconstruction in India' These were published in September, 1959, and were translated by Dr Abid Husain in May, 1962 The translation was published under the title Hindustan Main Taleem Ki Az-sar-i-nau Tanzeem

1962 Was appointed Vice-President in May Received the highest title of the country 'Bharat Ratan'

1964 The President, Radha Krishnan had an eye operation He was therefore, entrusted to discharge the duties of the office of President of India under section 65(2) of the Constitution Addressed the Parliament as the Acting President

1968 Presided over the golden jubilee celebrations of Darul Mussanifeen (Shibli Academy) Azamgarh Announced an aid of Rs 50,000,- to the institution from the Government of India

President of India, Dr Radhakrishnan went to London Zakir Saheb took the oath of office as Acting President, on March 16

A collection of his educational addresses delivered in English were published under the title 'The Dynamic University'

1967 *Michigan* University of America conferred the honorary degree of Doctor of Laws on April 29 It was an honour of singular distinction He returned during the hectic activity of the Presidential elections Significantly he returned only three days before the election, and was away from the political manoeuvres of the days It was announced on May 9 that he was elected by an overwhelming majority

1969 He had a fatal heart attack on May 3, at 11 20 a m and was buried on May 5 after Maghrib prayer at about 8 00 p m with full military honours in Jam a Millia Islamia, an institution that he established and maintained through the sweat of his brow

---

1937 Gandhiji called an educational conference at Wardha Zakir Saheb was elected the President of the Committee which was set up to formulate the scheme and curriculum

1943 Collection of his educational addresses and radio speeches were published in the month of March under the title 'Educational Addresses

1944 Delivered ten lectures on 'Capitalism' on the request of the then Vice-Chancellor, Delhi University, Mr Morris Gyre These were later on published in book—form Second edition was published in 1967

1946 Had translated a book by the famous German philosopher Fredrick List, which was not published till then It was published in April, under the title 'National Economy '

1948 Maulana Azad persuaded him to accept the Vice-Chancellorship of Aligarh Muslim University Nawab Ismail Khan (Vice-Chancellor) proposed his name in the meeting of the University Court on Nov 28, which was unanimously accepted by the members

1951 Presented a memorandum to the Education Minister, U P demanding arrangements for the education of children through Urdu medium The memorandum bore signatures of ten thousand citizens of Lucknow city. He was re-appointed Vice-Chancellor of the Aligarh Muslim University on November 29 (According to new rules)

1952 He was nominated a member of the Rajya Sabha while on a visit to America He took the oath on August 11

1954 Presented a memorandum to the President of India demanding Urdu to be the second regional language of U P The memorandum was signed by two lakh adult citizens of U P Received Padma Vibhushan on August 15 Went to Cairo on a UNESCO deputation on December 15 to introduce the Basic Education to the Arab World

1956 Renominated member of the Rajya Sabha Took oath on April 26 Went on a fifteen days visit to Saudi Arabia on the invitation of King Saud Tendered resignation from the Vice-Chancellorship of Aligarh Muslim University more than one year before the expiry of his term Resignation was accepted with effect from September 15 after great hesitation He came back to the Jamia in the expectation of getting some rest which he badly needed, but was soon appointed a Government delegate by Maulana Azad to a UNESCO meeting to be held in Delhi UNESCO nominated him a member of the executive and asked him to visit Europe in this connection While under medical treatment in Germany, he received a wire from the Prime Minister, Jawaharlal Nehru not to refuse the Governorship of Bihar for which his name was being proposed

ZAKIR SAHEB IMPORTANT DATES

A L AZMI

1897 Born in Hyderabad, February 8 (app)

1907 Took admission in the Islamia High School, Etawah, U P

1913 Passed High School from Etawah Took admission in the M A O College, Aligarh in Intermediate (Science)

1915 Took admission in B Sc in the Christian College Lucknow, left the College due to illness

1918 Passed B A from the M A O College, Aligarh

1919 Passed M A (Previous) in Economics from the Muslim University, Aligarh

1920 Jamia Millia Islamia was established as a result of Non-Cooperation Movement Being one of the founder members Zakir Sahab devoted all his energies for the establishment of the Jamia

1922 Translated the book 'Elementary Political Economy' by Prof Edwin Canon It was published under the title 'Mubadi Moasheeat' Left for Berlin for higher studies

1925 Completed Ph D from Berlin University, Title of the thesis "The System of Indian Agricultural Economy"

1926 Returned from Germany, Dr Abid Husain and Prof M Mujeeb accompanied him and joined the Jamia, Zakir Saheb was entrusted with the duties of Shaikhul-Jamia

1932 Zakir Sahib had started translating the 'State' by Plato when he was a student of M A class It was published under the title 'Riasat A revised edition was published in 1967 Read a paper in Hindostani Academy U P (Allahabad) on March 6,7,8 The same was published in book-form under the title "Economics—Aims and Means

Hussain once said that after years of thinking on the subject, he had come to the coviction that work is the only instrument of effective education He stressed that the idea of educationally productive work should inform the thinking on basic education

Regarding the women education, Dr Zakir Hussain expressed the views that women should not be freakish brittle imitations of men, women have to be true to their nature which alone can lend them strength and dignity Women have the power to create gracefully adjusted and vigorous national life out of the beauty of their homes It should be the resolve of each woman that within the limits of her influence no child should be denied its right to play—and to laughter to love and attention and no child should go to the school as a problem The education of women should be a balance of home and outside functions and all the free professions should be open to women

He has contributed lively short stories for the juvenile literature and he advised the writers of children to use their stories to encourage the child's natural feeling of belonging to the Indian people and to the great human family

Dr Zakir Hussain made an integration of material and spiritual values of life According to him it is necessary to combine power with morality, science with ethics The scientists and technologists must not forget the social references and moral commitments

Dr K G Saiyidain, a prominent educationist has aptly said, "Economist by training, educationist by profession, humanist by temperament, Dr Zakir Hussain is easily one of the most creative and distinguished living educationist of India He has been an important liberating force in education, enriching its purpose as well as content , experimenting in methods and techniques, elucidating its true relationship not only with the national past, present and future but also with the precious legacy of man as a whole He has, on the one hand, shown sensitiveness to its social and psychological foundations and on the other, been deeply involved in its moral and spiritual implications No better expression in so few words would aptly glimpse the greatness of this vital thinker and valiant worker, Zakir Hussain He stands for learning and scholarship, for wisdom, poise and dignity, for better commitment to high principles and values He believed in a constant persuit of excellence and hoped for a truly cultural national existence

---

AN EDUCATIONIST

SARDA RAM VERMA (B Ed)

As a grateful nation we think with pride and pleasure as well as esteem and reverence of what Dr Zakir Hussain has given to the glory of our nation He was a teacher and a thoughtful leader of his people Integrity, moral courage compassion, culture and refinement, affection and sympathy receptivity to new ideas and loyalty to old ones belong to him and have made him a great personality

Dr Zakir Husain formulated a new education structure, strong and broad based, a new outlook fresh and untrammelled by the misery of the past, a new cultural setting, vitalizing and invigorating and a new pattern of national character and thus the scheme of basic national education was framed He evolved a system of education which will be in harmony with the genius of the Indian people, and solve the problem of mass education It give the people of India something quite basic and vital that could enrich and energise the national mind, soul and character

His greatest contribution to education is the philosophy of work Work has been generally viewed as the opposite of play and characterised by the absence of spontaneity and joy The new scheme of Mahatma Gandhi of basic education provided a wider field to Dr Zakir Husain for developing the idea of work Gandhiji emphasised that basic education should be imparted through some craft and productive work Dr Zakir Husain fully commended the idea of educating children through some suitable form of productive work and considered it as the most effective approach to the problem of providing an integral all sided education Dr Zakir Husain in his own words gave one of the finest statement about the meaning of work in education as, "Let those who wish to make work the medium of education, remember that work is not purposeless, that it is not content with any result that may follow Work does not mean the passing of time by doing any haphazard thing, it is not an amusement it is not play, it is work, it is purposeful striving" Dr Zakir

the boy without saying anyting and started taking th at left over-se up himself The little incident impressed the boy so much that he always took care to see nothing was being wasted

Dr Zakir Husain was a picture of simplicity Whosoever came to see him at Rashtrapati Bhavan, was seen off to the door after the meeting by Zakir Saheb himself Sometimes, he would even unbolt the door for the guest himself When asked why he was so humble inspite of being a President, he used to say, 'I always keep in mind that one day I have to leave this Bhavan and retire to my own house How can I change my habits which have been useful in bringing me success in life ? How can I keep those habits aside even after coming to Rashtrapati Bhavan '

Dr Zakir Saheb believed in doing more than in mere saying, whenever he got an opportunity to address the public, he used to emphasize that no nation can progress without working hard He was not used to giving long lectures He had a knack of conveying his opinions with a touch of humour and which left a mark on the minds of people

People know Zakir Saheb well as educationist and a patriot What I would like to emphasize are his human qualities which made others not only respect him but also to love him He was the soul of courtesy and was kind and considerate to all around him He was always modest and soft spoken He had a sense of humour and he knew that a little wit and wisdom often relieves the tedium of life

Dr Zakir Husain had a deep love for art of any kind He had a beautiful museum which consisted of various types of artistic stones, pictures and other work of art Also he was a great admirer of nature He loved flowers especially roses since his very childhood But most of all he loved people He had a great faith in humanity and favoured good relations between man and man All his life he strived to become a good human being and who would not agree that he succeeded in reaching his goal !

We can learn a geat deal from the life of our late beloved President, Dr Zair Husain We can only pay our true homage to him by taking a pledge that we will always try to become a good human being

---

AN INDIVIDUAL

VEFNA RAMTRI (B Ed)

Frankly speaking, I did not know much about Dr Zakir Hussain before coming to Jamia Millia Islamia, except that he was the third President of Independent India It was only in this institution of which he was among one of the founders too, that I came to know about many sides of his personality And now I have come to admire him as a **man** of wit, wisdom and art

Dr Zakir Husain was first and foremost a teacher and his methods of teaching were unique Whatever he used to say and whatever advice he gave to others, he used to practise the same himself Or rather it would be more appropriate to say that he used to do something in the presence of others without saying anything and people would get to learn themselves whatever he wanted to convey He was not a man to impose himself on others He had an excellent method of putting people on the right path

Here it would not be out of place to give an account of an incident which one of our teachers related to us about him the other day Once when he was a teacher in Jamia Millia and our teacher was a student of his, Dr Zakir Husain reached the school and saw that the toilets were not clean He did not say anything to anyone Instead he called our teacher who happened to be there and asked him to bring a bucket of water When water was brought, he took a broom and started cleaning the toilets himself When, out of sheer shame our teacher offered to help him Zakir Saheb burst out, 'Why did not you think of this before ? Had you not seen that the toilets were dirty ?" and so on From that day every care was taken to keep every place clean and tidy Such was his way of getting work done by other

Zakir Saheb hated wastage of any kind Here is an incident narrated by his daughter, Begum Sayeeda Khurshid One day he want to inspect the dining hall of Boy s Hostel He saw that a boy had left aside a plate of soup, which probably he did not like Zakir Saheb went and seated himself beside

India, a party which is avowedly anti-democratic, describing the late President as the very embodiment of the principle of secularism and national unity who held the country's most elevated office with a rare blend of dignity charm and profound humanism Jamia Millia Islamia to which he gave his life, and where his remains are enshrined after death will ever remain a living monument to his ideals of democracy and national education

---

"Freedom is never given, it is earned, and kept only by those who continue to earn it every minute of their active life"

Dr ZAKIR HUSAIN

He identified himself with the mainstream of Indian culture, felt proud of the common heritage and in turn, he richly contributed to it. He pledged himself to the totality of our past culture from wheresoever it may have come and by whomsoever it may have been contributed. He pledged himself to the service of the totality of this country's culture and to work loyally for the welfare of its people without distinction of caste colour or creed. In his own words he said, "The whole of Bharat is my Home and its people are my Family." What noble ideas and what a symbol of Indian democracey.

Though Zakir Hussain was drafted by Jawahar Lal Nehru into political life, in 1952 and he became a Member of Rajya Sabha, Governor of Bihar, Vice President of India, and President of the Republic in succession yet education remained his first love and prime concern for the major part of his life. He considered himself first and foremost an educator. Even when elected President of the Republic, he saw the teacher in him being bestowed with honour by the nation. His life span covered nearby 3 decades as Vice Chancellor of Jamia Millia during which he shone like a pole star on the firmement of Jamia Millia and guided its destiny. In fact Zakir Hussain is so intimately identified with Jamia Millia that there can be no mention of Jamia Millia without Zakir.

Zakir Hussain had chosen the path of education by design, deliberation and conviction and it was no mere accident of life. He believed that national education is inextricably involved in the quality of nation's life, and is indeed a prime instrument of national purpose. He saw education as the life breath of our democratic life, and chief formative force of nation's life. He reasoned that there can be no national integration unless we succeed in making of our national state demonstrably a moral entity and forming an integrated community in a secular and democratic state. It was thus to serve India and the cause of democracy that he chose the path of educatien. Left to himself, Zakir Hussain may never have entered political life, as he firmly believed that genuine national renaissance cannot be ushered in through the narrow gate of politics, that it must have its roots in a renaissant education and culture. Though as Vice Chancellor, Zakir Hussain kept Jamia Millia keyed to nationalist aspirations of the freedom movement, yet he kept it aloof from active participation in politics explaining that Jamia itself is engaged in training soldiers for the war of Independence. The critics had no reply and were effectively silenced. The waves of national struggle, often lashed at the banks of Jamuna at Okhla, but were prevented from sweeping away Jamia Millia in its tide by the wisdom and foresight of its Vice Chancellor.

The passing away of the President suddenly in 1969 brought forth several touching references to his qualities of head and heart, to his erudite scholarship, and the many splendoured services rendered by him to the cause of education and Indian democracy. There can be no more eloquent proof of Zakir Hussain's services to Indian Democracy than the Communist Party of

A SYMBOL OF INDIAN DEMOCRACY

Miss MADHU SHARMA (B Ed)

Zakir Hussain by coincidence of History, was born in 1897 when Indian nationalism was nascent entered public life in 1920 when Indian nationalism entered its active phase with the advent of Gandhiji on the Indian political scene, and passed away in 1969 when the foundations of Indian democracy had been laid true and deep Born in a family of devout Muslims, young Zakir had realised the essential unity of all religions and the common heritage of India's culture While still a student of Aligarh Muslim university, he felt stifled with the narrow conservatism of its environment and disillusioned with the separatist tendencies that had found breeding place in Aligarh Therefore, when Gandhiji visited Aligarh in 1920 and gave a call to students to boycott educational institution serving British Imperial ends, and instead to develop centres of national education, it struck vibrant chords in the heart of young Zakir who walked out of the college campus alongwith a band of patriotic students and teachers and joined the rival national Muslim university which is known today as Jamia Millia Islamia Zakir Hussain had crossed the Rubicon, and there was no turning back thereafter

Thus, at the feet of Gandhiji, began the public career of Zakir Hussain, a life of deep social involvement and devotion to the cause of education and Indian democracy which saw him as a Vice Chancellor of Jamia Millia at the green age of 29, and culminated in his becoming the first citizen of India in 1967 In 1969, he died in harness as the President of the Republic at the ripe age of 72 In 1963, he was awarded the highest honour of the land, the Bharat Ratna for his great services to the nation

Zakir Hussain was a patriot, not a politician He was a democrat whom power would not corrupt Indeed he was pledged to serve all humanity, and he entered the high office in a spirit of prayful humility and total dedication

challenge of our newly-won freedom which has all at once made it possible for us to deal, as best we may with old and menacing challenges that had long been waiting to be met, the challenge of intellectual slovenliness, the challenge of moral insensitiveness, the challenge of social injustice, the challenge of narrow corporate selfishness of the hatred of creed towards creed and caste towards caste, the challenge of ignorance, But I can see and wish my younger friends to realize that the diseases and disabilities we are up against are not such as can be removed by working ourselves up to a frenzy and ending in a supremely heroic but short lived effort What we are primarily called upon to do is not to destroy but to build No senseless annihilation is required but deliberate construction Work, work work, silent and sincere work, solid and steady reconstruction of the whole material and cultural life of our people



"The education of a mind is essentially a process of revivifying in it the latent values contained in cultural goods'

Dr ZAKIR HUSAIN

The trasnsmission of knowledge accumulated through hard work of generations can be very important from the point of view of preserving knowledge but it can never bring about satisfaction to the yearning soul by merely keeping it in memory Individuals being different in their physical and mental make up have to go through experiences in order to adapt themselves to the acquired knowledge and vice versa And it was this conviction that ushered full significance of work to him Work, productive and useful, was the sheet anchor of his educational scheme that found expression in the Basic Education Work gives meaning and originality to knowledge gained through it and brings satisfaction to the possessor In his words

"Kaam Bay maqsad nahin hota, Kaam har nateejey per raazi nahin hota, kaam kuch kar kay waqt kaat deynay ka nam nahi, kam khali dillagee nahin, kaam khel nahin, kaam kaam hai, ba maqsad mehnat hai"

Intellectual work is after all not the only work for an educated person' [1]Yet our educational institutions, more out of necessity than design have accepted intellectual work as their prime concern No wonder the institutions in pursuance of this aim emphasise on individual achievements and not on collective good Whereas work of the type that Zakir Sahib advocated engenders fellow feelings and social responsibility The idea of work, if given a fair trial, will go a long way in easing tensions in our academic life

The other thing that he has somewhat emphasised is the spiritual aspect of human personality It may appear but is definitely not, a contradiction of his concept of work Each individual should be given full opportunity to develop not as a generic type'[2] but as a type by himself having material as well as spiritual needs This development is possible only by contact with goods of culture which are the products of mental effort of similar mental structures" [3]

If culture here is taken in its wider sense as expression life through Art, Literature Religion etc then each individual should have the opportunity of easy access to them This would provide a satisfying spiritual experience to individuals, and would have a singularly stabilising effect on their minds Zakir Sahib has called this effect 'a sense of permanance If outer conflicts are the extensions of inner ones then many angry youngmen of today will find no reason to be so angry Perhaps some of us may not agree with this conclusion and others may find in it an effort to continue the status quo And so, let me conclude by quoting Zakir Sahib from the Convocation address of Lucknow University, Jan 28, 1958

"I sometimes wonder if the generation that is young today realizes the tremendous nature of the challenge with which it is faced It is the

1 Zakir Husain, The Dynamic Unversity Bombay Asia Publishing house, 1965, p 25
2 Ibid p 28
3 Ibid p 28

ZAKIR SAHEB AND STUDENT UNREST

MASROOR HASHMI

Hardly a week goes by when news of a strike and subsequent closure of one or the other educational institution is not reported in newspapers. Sometimes strikes attain serious proportion, police intervention is sought by authorities to keep students in check from wanton destuction of public property. This leads to stiffening of attitudes and consequent enlargement of conflict. The trajectory ends in some kind of mutually acceptable formula, and strike subsides. People have been discussing the causes and cures of the malady ever since it became worthy of public notice. Much has been said about the role of political parties, the old bureaucratic attitude of concerned authorities, lack of pupil teacher relations, fear of future unemployment, negligence on the part of parents. Perhaps all these causes and many more constitute the problem. Remedial measure being temporary by nature have always fallen short of a permanent solution and the problem of student unrest is very much there.

My ignorance of Zakir Sahib's literary accomplishments cautions me not to give a bold statement that he had realised the full significance of the problem and had given a solution too. But he had put forward ideas which, if practised, might contribute towards the solution of the problem. His life long association with educational institutions and especially with the Jamia where he had the choice to put his ideas into practice, had made him form an opinion that education and not instruction alone can serve the purpose of enlightened citizenship. He made a sharp difference between education and instruction.

> "Knowledge, as you would easily see, can be of two kinds: it may be knowledge acquired by someone else by his labour and passed on to us as information, or it may be knowledge acquired by us through our own experience, knowledge that has grown in our mind by its work ... the first is instruction, the second education. (Convocation Address, Lucknow University, Jan 28, 1958)

the institutions teachers, administrative staff and the junior staff He felt concern for the welfare of all his colleagues He would sense it if anyone was facing some difficulty and do whatever he could to lessen it This reminds me of an occasion when a colleague s wife felt embarrassed to go back to her home town for want of proper clothes Those were the days when the Jamia could not pay its teachers even for their bare necessitie of life Zakir Sahib somehow sensed it, and managed to advance some money for the purpose He continued to feel for his old colleagues in the Jamia the same way even when he was not formally concerned with the day-to-day matters of the Jamia When he was serving as Vice-President of India, and the Jamia had to make rules for the retirement of its teachers in pursuance of the recognition of the Jamia as a demeed university, his mind was very much exercised over the plight of some of his erstwhile colleagues after their retirement, who would have little to fall back upon



"Never secumb to the appeal of a narrower at the expense of a wider loyalty'

Dr ZAKIR HUSAIN

be acceptable to a person he would visit him at his place and confer with him as persuasively as he could, and often he would succeed in making it palatable He endeared himself to everybody through this kind of approach Everyone had the feeling that Zakir Saheb cared for him and recognized his worth. This is the secret of the love and regard that the Jamia Biradari (community) extended to him

Zakir Saheb was an astute dialectician If you approached him for a discussion on 'men and matters he would deliberately take an opposite stand and advance his arguments to refute your views Thus he would try to fathom the depth of your thinking and to gauge the strength of your position This encounter would generally culminate in identification of weaknesses in the rationale, and clarity of thinking

Essentially a man of ideals, as he was, Zakir Saheb combined his idealism with the robust common sense which he possessed in ample measure He believed that after all it was the man who was decisive in everything that was aimed at and planned One could not build castles in the air It was the human material that would ultimately determine both the nature of the effort that could be made and the success that could be achieved That is why he would advise us to attempt such projects as we could pursue with the human and the material resources we had He possessed a penetrating insight into human affairs He could make almost a correct estimate of a man's worth, his assets and liabilities his potentialities and limitations In the light of his estimate, he would assign the right task to the right person and at the right occasion And this procedure was doubly blessed The task was completed successfully, on the one hand, and the person concerned found an opportunity for self realisation, on the other That is how, he helped to make writers out of those who had earlier dared not to publish anything creative teachers out of these who had neither adequate academic nor professional background, and educational administrators out of these who were quite freshers in the field

Whether Zakir Saheb himself ever claimed to possess power of intuition is a controversial matter Some of his close associates asserted that he was endowed with such a power that made him do certain things for which there was no objective basis or rational ground But even in regard to such things one might say that those of his acts which are credited with intuition were an evidence of his superior intelligence that enabled him to see far ahead So sharp was his intellect that he at once got at the crux of the problem that confronted him, and took steps accordingly As there was apparently no justification for such action, it was attributed to what is called 'intuition' People who came in contact with him have sometimes realized that he discovered their real intention in the first few statements even if those were made in a well-guarded language

The most distinctive quality of Zakir Saheb was his deep humanitarianism He showed due consideration for all the workers of the Jamia—heads of

ZAKIR SAHEB—SOME RECOLLECTIONS

Dr SALAMATULLAH

He left the Jamia in 1948 to join the Aligarh Muslim University, and ever since he had been physically cut off from us except for a few occasions when he paid us a casual visit All the same, we kept on feeling his presence around us His influence was manifest both in our thinking and doing And it is not a matter of surprise for, most of us were attracted to the Jamia in our youth by the magnetic personality of Zakir Saheb Some found in him a source of sustenance for their religious and moral values, while the others looked upon him as a symbol of nationalism and felt inspired by his struggle to evolve an independent system of education suited to the dignity of a free people

To most of us Zakir Saheb was a friend philosopher and guide all rolled into one We had so much confidence in him, and he was so unassuming, that we would turn to him for his advice even in our most intimate and personal affairs We could discuss anything with him without hesitation If one did not feel convinced with his point of view he was gracious enough to tolerate disagreement He would never try to force his views on those who differed

This reminds me of certain encounters I happened to have with him in advancing some causes in my youthful enthusiasm But that did not affect his judgement adversely of my conduct, and I received all consideration and support from him subsequently He was a model of a self disciplined man Even the most un-called-for provocation would not unhinge him He could exercise control over himself in situations which would generally drive others to exasperation That is why people in the Jamia used to say, "Zakir Saheb has an unlimited capacity for tolerance"

He developed a unique way of dealing with his colleagues It was the intimate and personal way If he suspected that a particular decission would not



ZAKIR SAHEB AT THE AGE OF EIGHT YEARS



Dr ZAKIR HUSAIN (1897—1969)

EDITORIAL

Miss MADHU SHARMA (B Ed)

It is my privilege to be the editor of the College Annual Our magazine generally includes articles of educational interest But this year we are dedicating a major portion of the magazine to commemorate the seventy-fifth birth anniversary of our Late President Dr Zakir Husain who was also the founder of the Jamia Millia Islamia Dr Zakir Husain needs no introduction Inspite of being a political leader Dr Husain was first and foremost a teacher The Jamia is greatly indebted to him for the guidance that it received from him and for the keen interest in its work that Dr Husain continued to show upto the last moments of his life

As usual this magazine is the result of a combined effort on the part of the students and teachers I take this opportunity of expressing my gratitude to Prof M Mujeeb, our Vice Chancellor and Dr Salamatullah, the Principal, Teachers College and the staff members for their invaluable contributions to the magazine I would also like to thank the students who inspite of tremendous pressure of work have obliged us with their articles

We hope the readers will find the magazine interesting and useful

---

INSIDE THIS MAGAZINE

Student Editors	English	**Miss Madhu Sharma (B Ed)**
	Hindi	**Miss Pushpa Sharma (B Ed)**
	Urdu	**Abdul Ghaffar Arshad (B Ed)**
Staff Advisor		**Masood-ul-Haque (Lecturer)**

Homage to Dr. Zakir Husain

TEACHERS' COLLEGE ANNUAL, 1972-73

JAMIA MILLIA ISLAMIA
Jamia Nagar, New Delhi-25